مرتبین
ڈاکٹر شفیق احمد
ڈاکٹر روشن آراء راؤ

اسلامیہ یونیورسٹی۔ بہاولپور

انتخاب

انشائیہ نمبر

مرتّبین

ڈاکٹر شفیق احمد

ڈاکٹر روشن آرا راؤ
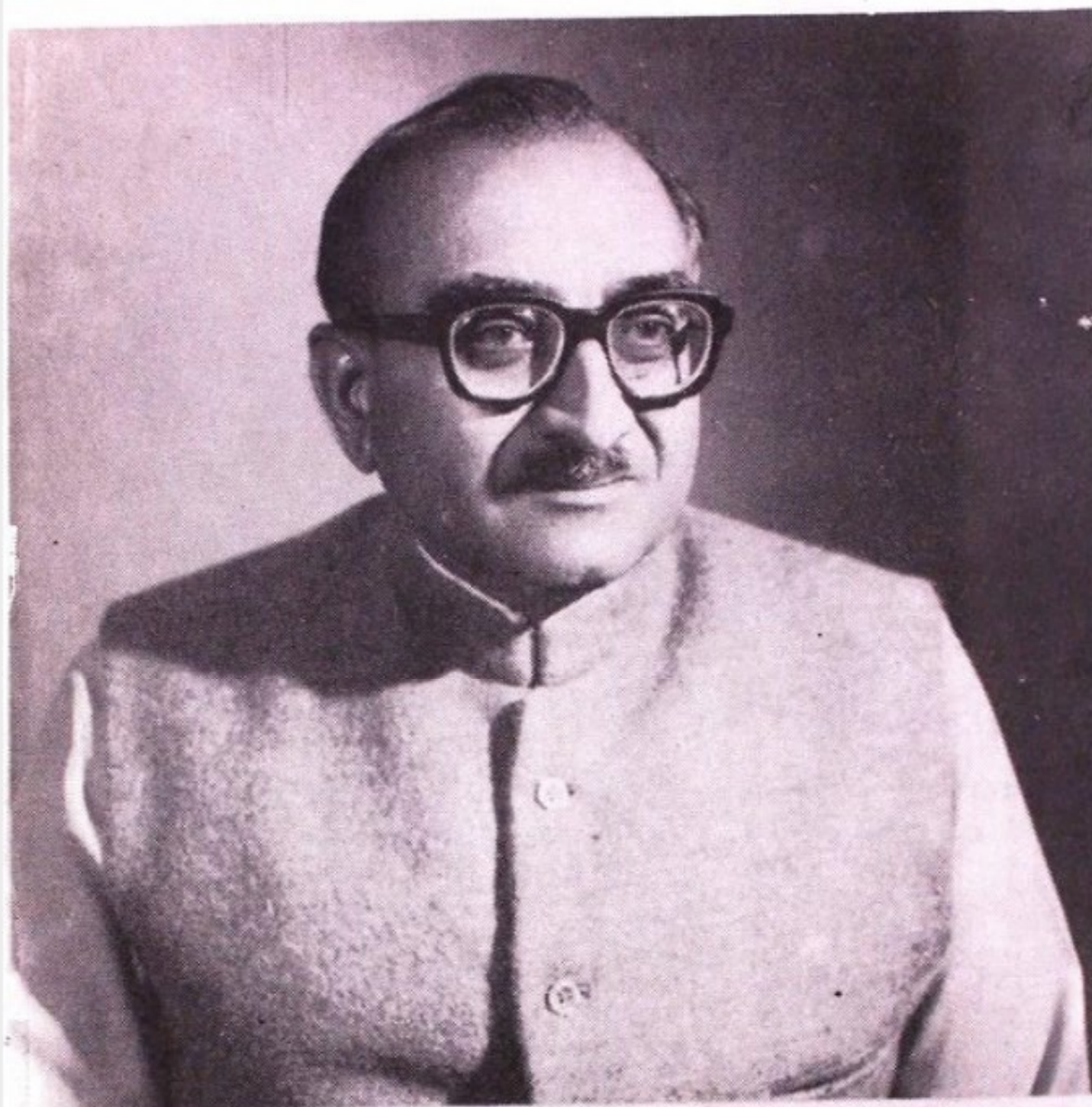
ڈاکٹر ذوالفقار علی ملک

وائس چانسلر، اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور

فہرس

"مطلع"

۱۹۸۳ئہ میں ایم اے اُردو کا نیا نصاب مرتب کیا گیا تو بہت سے پرچوں میں جدید اصنافِ نظم و نثر اور جدید تر عہد کے لکھنے والے ادبا، و شعرا کی رشحاتِ فکر کو شامل کیا گیا تھا لیکن جلد ہی یہ دُشواری محسوس کی گئی کہ نئے نصاب میں شامل اکثر موضُوعات پر کلاس لیکچرز کے علاوہ اور کوئی ایسا اضافی مواد دستیاب نہیں جس کی مدد سے طلبا، و طالبات اپنے اِمتحانات کی تیاری کر سکیں۔ اس ضمن میں اگر کچھ تھا بھی تو اوّل تو بہت کم دُوسرے زیادہ تر بکھرا ہُوا۔ اس صُورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے کے دو طریقے اِختیار کئے گئے۔ اوّل یہ کہ ایسے نصابی موضوعات پر طلبہ و طالبات سے تحقیقی و تنقیدی مقالات لکھوائے جائیں۔ دوم معروف اہلِ علم حضرات کو دعوت دی جائے کہ وہ تشریف لائیں اور اپنے خُطبات کے ذریعے ہماری رہنمائی فرمائیں لیکن کئی برس کے تجربے کے بعد محسُوس کیا گیا کہ یہ طریقِ کار اپنی تمام تر افادیت کے باوجُود ناکافی ہے۔ لہٰذا کوشش کی گئی کہ مختلف موضوعات پر ایسے مذاکرے اور سیمینار منعقد کئے جائیں جو نہ صِرف ہمارے طلبا، و طالبات کی ضروریات کے نقطۂ نظر سے کافی ہوں بلکہ اپنی دلچسپی کے اِعتبار سے علمی و ادبی حلقوں کی توجہ بھی اپنی جانب مبذول کرا سکیں۔

تیسرا حصہ۔ کوائف نامہ

چوتھا حصہ۔ رپورتاژ، کالم

اس سلسلے میں موضوعات کی ترجیحات کا سوال پیدا ہوا تو سب سے پہلے نظرِ انتخاب "انشائیہ" پر پڑی۔ لہٰذا ۲۶، ۲۷ مارچ کو انشائیہ سیمینار کا انعقاد کیا گیا۔ علمی و ادبی حلقوں میں سیمینار کی پذیرائی اور اس میں پڑھے گئے گرانقدر مضامین و مقالات کی افادیت کے باعث یہ مناسب سمجھا گیا کہ مقالات کو مرتب کر کے شعبۂ اُردو و اقبالیات کے تحقیقی مجلے "انتخاب" کے انشائیہ نمبر کے طور پر شائع کیا جائے۔

ہم نے مجموعہ ہائے مضامین کی ترتیب میں برتے جانے والے عمومی اصول کو نظر انداز کر کے یہ طریقہ اختیار کیا کہ جو مقالات اور انشائیے جس ترتیب سے سیمینار میں پڑھے گئے انہیں اسی ترتیب سے مجموعے میں شامل کر دیا جائے۔ شاید یہ اصول شکنی بعض نازک طبائع پر گراں گزرے لیکن اوّل تو یہ اس لئے ضروری تھی کہ ہم اپنی کھال بچانا چاہتے تھے دوم اس صورت میں سیمینار کی حقیقی ترتیب بھی محفوظ رہ جائے گی۔ مثلاً ۲۶ مارچ کی نشست میں صنفِ انشائیہ پر تنقیدی مضامین پڑھے گئے۔ سو پہلے تنقیدی مضامین ہی کو جگہ دی گئی اور بالکل اسی ترتیب میں جس طرح کہ یہ پیش کئے گئے تھے۔ ۲۷ مارچ کی نشست میں انشائیے پڑھے گئے تھے۔ لہٰذا تنقیدی مقالات کے بعد انشائیوں کو مرتب کیا گیا اور ان کی بھی وہی ترتیب برقرار رکھی گئی جس ترتیب سے یہ سیمینار میں پڑھے گئے تھے یہاں پر اس امر کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ اگرچہ ڈاکٹر وزیر آغا صاحب علالتِ طبع کے باعث سیمینار میں شرکت نہیں فرما سکے تھے لیکن انھوں نے ازراہِ نوازش اپنا مضمون اور دو انشائیے بھیج دیئے جس کے لئے ہم ان کے شکر گزار ہیں۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر انور سدید صاحب نے سیمینار میں اپنا صرف ایک مقالہ اور ایک انشائیہ پڑھا تھا لیکن چونکہ ہمیں ان کا مزید ایک مضمون اور انشائیہ مل گئے لہٰذا انھیں بھی مجموعہ میں شامل کر لیا گیا۔ جناب مشکور حسین یاد کا ایک انشائیہ تو وہی ہے جو انھوں نے سیمینار میں عطا فرمایا تھا البتہ "انکسار کے آسمان" ایسا انشائیہ ہے جو سیمینار کے بعد موصول ہوا۔

استادِ محترم جناب ڈاکٹر وحید قریشی صاحب نے دونوں نشستوں سے خطاب فرمایا تھا لیکن بدقسمتی سے صرف نشستِ اوّل کا خطاب صدابند کیا جا سکا جو مجموعہ میں شامل ہے۔ دوسری نشست

کے خطاب کا دلچسپ نقطہ یہ تھا کہ دیگر شہروں کی نسبت بہاول پور کے ریگزار میں بہتر انشائیہ لکھا جا رہا ہے کہ یہاں انشائیہ یا انشائیے پر لکھتے ہوئے ادیبوں اور ناقدین کو اُس اعصابی تناؤ سے دو چار نہیں ہونا پڑتا جو دیگر شہروں کے ادیبوں کا مقدر ہو چکا ہے۔ اُنھوں نے اس امر پر بھی سیمینار کے منتظمین کی تعریف کی تھی کہ مختلف دبستانوں سے تعلق رکھنے والے ادیبوں اور ناقدین کو بڑی کامیابی سے ایک پلیٹ فارم پر جمع کر لیا گیا ہے۔

"انتخاب" کا تیسرا حصہ ایک رپورتاژ اور ایک کالم پر مشتمل ہے۔ ان تحریروں سے ایک طرف تو سیمینار کی تفصیلات سامنے آتی ہیں۔ دوسرے اُن تقریبات اور سرگرمیوں کا بھی بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے جو ان دنوں سیمینار سے ہٹ کر برپا ہوئیں لیکن جو سیمینار ہی کی مرہون منت تھیں تیسری بات یہ ہے کہ ان سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ علمی و ادبی حلقوں میں سیمینار کو کس طرح اور کتنی پذیرائی ملی؟۔ "انتخاب" کا چوتھا حصہ نسبتاً بہت مختصر ہے۔ دراصل اِس حصے میں مضامین و مقالات اور انشائیے پڑھنے والے حضرات کے مختصر کوائفِ حیات درج کیے گئے ہیں۔ نیز بہاول پور سے تعلق رکھنے والے ان ادیبوں اور شاعروں کے کوائفِ حیات شامل کر دیئے گئے ہیں جن کا ذکر رپورتاژ یا کالم میں آیا تھا۔ گو یہ تعداد ادیب و شاعر شرکا کی تعداد سے کوئی نسبت نہیں رکھتی۔ بہر حال......

آخر میں مَیں جناب ڈاکٹر ذوالفقار علی ملک وائس چانسلر اسلامیہ یونیورسٹی اور جناب ڈاکٹر مصباح العین ڈین فیکلٹی آف آرٹس کا شکر گزار ہوں۔ جن کی فراخدلانہ سرپرستی اور رہنمائی کے باعث سیمینار کا انعقاد اور "انتخاب" کے "انشائیہ نمبر" کی ترتیب و اشاعت ایک خواب سے حقیقت کا روپ دھار سکی۔ اُمید ہے کہ رہنمائی اور سرپرستی کا یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے گا۔

اس کے علاوہ بیگم نذیر ناز اور آنسہ ارم ضیاء کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے مقالات کی ترتیب و تدوین اور پروف ریڈنگ میں میرا ہاتھ بٹایا۔

پہلا حصّہ

اِنشائیے کا تنقیدی دَور

ڈاکٹر اسلم ادیب

ہمارے مُلک میں ادیب اور شاعر نے جس قدر غیر معمولی کوششوں سے جاندار ادب تخلیق کیا ہے۔ ادبی نقّاد نے اپنی غیر متوازن گفتگو سے اتنا ہی ادب کی دُنیا میں فتنہ و فساد برپا کیا ہے۔ اِس لئے کہ اگر کسی نے اپنی تخلیقی صلاحیتّوں کی بُنیاد پر کچھ تخلیق کیا تو نقّاد چاروں طرف سے کسی شیر کی طرح اِس تخلیق پر لپکتے ہیں۔ کوئی اِس تخلیق کے موضوع کی ٹانگ توڑتا ہے تو کوئی مرکزی خیال کی گردن مروڑتا ہے اور کئی تو اسلوب کی ہڈیاں تک بھنبھوڑ ڈالتے ہیں۔ اِس حد تک تو پھر بھی گوارا تھا کہ اس طرح کم از کم تخلیق کار کی جان بچی ہوئی تھی۔ لیکن ستم یہ کہ نقّاد تخلیق کی دھجیاں اڑانے سے پہلے تخلیق کار کا شجرۂ نسب بھی معلوم کرنے لگا ہے۔ کہ تُم نے یہ تخلیق کیسے کیا؟ کیوں کیا؟ عالم ہوش میں یہ حرکت ہُوئی یا عالم جوش میں تمہارے ذہن کی کونسی باسی کڑی میں اُبال آیا تھا تُم نے فلاں ابن فلاں سے اس تخلیق کے بارے میں رائے لی اور جو ہم نے رہنما اصوُل بنائے ہیں کیا اُنھیں ملحوظ خاطر رکھا؟

اس صورتِ حال میں یوُں محسوس ہوتا ہے جیسے نقّاد کا منصب بدل گیا ہے۔

وہ ذوقِ سلیم کا مالک ہو یا نہیں کم از کم گروہی تعصبات سے باخبر ہو۔ تخلیق کا تجزیہ کرنے سے پہلے تخلیق کار کی حمایت یا مخالفت کرنے کا طے کرلے اور تخلیق میں جو کچھ ہے اس پر لکھنے کی بجائے وہ لکھے جو اسے آتا ہے اور جس سے اس کی علمیت کا رعب پڑ سکے۔

اس طرزِ عمل سے تخلیقی معیار برقرار رکھنے اور اصنافِ ادب کی سمت متعیّن کرنے کا جو منصب نقّاد کو سونپا گیا تھا اسے خاصا نقصان پہنچا۔ اس سے نقّاد کی اپنی حیثیّت بھی خاصی مشکوک ہوئی۔ نقّاد جو تخلیق کار اور قاری کے درمیان ابلاغ کا سلسلہ برقرار رکھنے کا واحد ذریعہ تھا اب معتبر نہ رہا۔ اِس لئے ادب کا قاری دِن بدن کم ہو رہا ہے۔ گو کہ ادب کے قاری کم کرنے میں تخلیقات کا قصور بھی ہے جو صِرف اظہار کی حد کو چھوتی ہیں لیکن ابلاغ کی سرحدوں میں داخل نہیں ہو پاتیں۔

لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ تخلیق کار کی نسبت ہمارے نقّاد نے ادب کے قاری زیادہ بدظن کئے ہیں۔ اِس لئے کہ ایک تو اُس نے قاری اور فن کار کے درمیان پُل کے فرائض انجام نہیں دیئے۔ دُوسرا نظری تنقید کے ایسے مباحث چھیڑے ہیں جن سے فن کار اور قاری دونوں confuse ہوتے ہیں۔ اس confussion کی بہترین مثال صنفِ انشائیہ ہے۔ جس کے بارے میں نقّادوں نے ایسی ایسی موشگافیاں کی ہیں کہ قاری انشائیہ پڑھنے کی بجائے ڈائجسٹ کی جاسُوسی کہانیاں زیادہ ذوق سے پڑھتا ہے۔ یُونیورسٹیوں کے طالبِ علم اِنشائیے کا سوال تیار نہیں کرتے۔ اساتذہ اِنشائیہ پڑھانے کی بجائے لطائف پر گذارہ کرتے ہیں اور ہمارے اِنشائیہ نگار ہر ایک سے پُوچھتے پِھرتے ہیں کہ یہ جو میں نے لکھا ہے انشائیہ ہی ہے نا۔

یہ بھی عجیب اتّفاق ہے کہ ہمارے ہاں اِنشائیے پر تنقید لِکھنے والے بیشتر انشائیہ نگار ہی ہیں۔ اس کا ایک اچّھا پہلو یہ ہے کہ چُونکہ وُہ اِنشائیہ تخلیق کرنے کا ذاتی تجربہ رکھتے ہیں اس لِئے اس کے اصُول بہتر طور پہ وضع کر سکتے ہیں۔ لیکن پریشان کُن پہلو یہ ہے کہ

زیادہ تر انشائیے کے اصول جو وہ بیان کرتے ہیں اُن کے ذاتی انشائیوں میں نہیں ملتے۔ مثال کے طور پر انشائیے کا لازمی جُز انکشافِ ذات کہا گیا ہے یا ذات کے پوشیدہ گوشوں کا اظہار یا ہموار شخصیت کا ادبی اظہار یا واحد متکلم میں اظہار۔ لیکن جمیل آذر کے انشائیہ "غیر معروف شہری" میں کہیں واحد متکلم نہیں۔

"ماڈرن دور کا یہی سب سے بڑا المیہ ہے کہ وہ آپ کو پیہم یہ احساس دلاتا ہے کہ آپ بے نام۔ بے چہرہ، غیر معروف شہری ہیں اور گوشت پوست اور رُوحِ لطیف سے مملو معزز انسان نہیں ہیں۔ کنڈکٹر آپ کو اپنی گربہ چشمی سے سواری میں تبدیل کر دیتا ہے اور دفتری تقاضے آپ کو شناختی کارڈ کے نمبروں میں بدل دیتے ہیں۔"

یہ پیراگراف سُننے کے بعد آپ مُشکل سے بتا سکیں گے کہ اِس میں تخلیقی سرگرمی کہاں ہے۔ انکشافِ ذات کتنا ہے۔ غیر مقصدیّت کہاں ہے اور جس مضمون کا یہ اقتباس ہے وہ اُمّ الاصناف کیسے ہے۔ مشتاق قمر کے انشائیے "بال کٹوانا" کا یہ اقتباس۔

"کتابوں کا مطالعہ نئی تہذیب کی کسوٹی ہے۔ ابھی تک تو کتابوں کے متعلق جمہُوری طریقہ رائج ہے۔ یعنی اُنھیں گنتے ہیں، تولتے نہیں لیکن زمانے کے انداز بڑی تیزی سے بدل رہے ہیں۔ دو واضح طبقے پیدا ہو گئے ہیں۔ ایک طبقہ اپنی تصانیف کی ضخامت کو کم سے کم اور دُوسرا زیادہ سے زیادہ کرنے کی طرف مائل ہے۔"

یہ انشائیہ بھی واحد متکلّم میں نہیں۔ اِس میں انکشافِ ذات کا بھی فقدان ہے۔ بلکہ خاصے بے ربط اور غیر متعلق خیالات سے آراستہ ہے۔ یہ اقتباس اپنے موضوع "بال کٹوانا" سے کہیں بھی مطابقت نہیں رکھتا۔

اسی طرح مشکُور حسین یاد کے انشائیے "سوچ کی آگ اور سمجھ کا سونا" کا اقتباس سُنیئے۔

"آدمی مسلسل سوچنے کا جانور ہر گز نہیں ہے۔ یہ تو مسلسل سمجھنے والا جانور ہے۔ اِس لِئے ہر آدمی، ہر وقت اور ہر جگہ کچھ نہ کچھ تو سمجھنے میں مصروف رہتا ہے۔ سوچنے کے لِئے اس نے چند نفوس کو چھوڑ رکھا ہے۔ جِن کے بارے میں وہ کوئی اچھی رائے نہیں رکھتا۔ اُس کا خیال ہے کہ سوچنے والے اشخاص یُوں تو بڑے دانش ور کہلاتے ہیں۔ لیکن ہوتے ہیں بڑے بے وقوف اور احمق۔"

یہ انشائیہ انکشافِ ذات کی بجائے تہذیبی المیہ ہے۔ اور ذاتی تجربے کی انفرادیت اجتماعیت میں گُم ہو رہی ہے۔

اب سلیم آغا قزلباش کے انشائیے "اُنگلیوں" کا ایک اقتباس۔

"اس ہنستی بستی دُنیا کی تباہی کا بٹن بھی فقط پانچ انگلیوں کے زیرِ نگیں ہے اور یہ پانچوں اُنگلیاں ایک طرح سے پانچ بڑی طاقتیں ہیں جو سارے جہان کو تگنی کا ناچ نچا رہی ہیں۔ اگر یہ اکٹھی مِل بیٹھ کر کسی کام کا تہیّہ کر لیں۔ تو وقت کے دھارے کا رُخ موڑ سکتی ہیں۔ لیکن ذرا سوچیں ہاتھوں کی اُنگلیاں نہ رہیں تو پھر کیا ہو۔ میرے خیال میں ایسا ہو جانے کی صورت میں سب سے زیادہ نقصان منگنی کی انگوٹھی کو پہنچے گا۔ اور اُس کے بعد پُوری نسلِ انسانی کو۔"

اس انشائیے میں self کا اظہار نہ ہونے کے برابر ہے۔ جب کہ اُنگلیوں سے متعلّق تمام ممکنہ حوالوں کو سمیٹ لیا ہے۔ البتہ اِس اِنشائیے میں نُمایاں طور پر creative attitude پایا جاتا ہے۔ ایک اور انشائیے کا اقتباس بھی ناگزیر ہے۔ اور وُہ ہے شہزاد قیصر کا "ایک اور ایک"

"دو کے لفظ میں اور بھی قباحتیں ہیں۔ دو دِن کی چاندنی والی بات تو

نہایت لغو ہے۔ چاندنی تو ہمیشہ رات کو ہوتی ہے۔ دن کو تو اندھیرا ہوتا ہے
دو دانے کو محتاج ہونا بھی کیا محاورہ ہے۔ اگر کوئی شخص واقعی دو دانے
کا محتاج ہو تو اہلِ ثروت اس کو یہ دانے عطا کر کے جنّت نہ خرید لیں۔ یہ
دو فصلی باتیں کیا ہُوئیں۔ یہ کسی لکھنؤ کے پٹواری کی اختراع ہے۔ دونوں
ہاتھوں سے کلیجہ تھامنے والی بات بھی مبہم سی ہے۔ اس سے یہ واضح
نہیں ہوتا کہ کلیجہ کس کا ہے۔"

یہ بڑا Tricky انشائیہ ہے۔ یُوں محسوس ہوتا ہے جیسے انشائیہ نگار نے لفظ دو
سے شُروع ہونے والے سارے محاورے جمع کئے ہیں۔ اور پھر ان کے حوالے سے انشائیہ
لکھا ہے۔ اس طرح تو یہ صرف ذہنی ورزش ہے۔

اس گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ انشائیے کے نقّادوں نے جو اصُول انشائیے کے وضع
کئے ہیں وُہ خُود ان اصُولوں کے پابند نہیں رہ سکے۔ تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا غلط ہے
اور کیا دُرست۔ یا تو انشائیے کے بیان کردہ اصُول غلط ہیں یا پھر لکھے جانیوالے انشائیے۔ اگر
قبُولِ عام کو سند سمجھا جائے تو صنفِ انشائیہ مقبُولِ عام کا درجہ پا چُکی ہے۔ لہٰذا نقّادوں
کی عالمانہ موشگافیاں مشکوک ہیں۔

اب اس confused صُورتِ حال میں ایک غیر جانبدار نقّاد کیا کرے۔ میرے
خیال میں اسے چاہیئے کہ وُہ نقّادوں کی نظری تنقید کو نظر انداز کرتے ہُوئے اُردو میں
آج تک لکھے گئے انشائیوں میں سے اصُولِ انشائیہ اخذ کرے۔ آخر ارسطو نے بھی تو
یُونانی ڈراموں سے ہی ٹریجڈی کے اصُول اخذ کئے تھے۔ انشائیہ اتنا لکھا جا چکا ہے کہ
اسے ایک علیحدہ صنف ماننے کے لئے مزید کسی تحریک کی ضرورت نہیں اور انشائیے کے
نام پر جو کچُھ لکھا گیا ہے۔ اس کا گہرا تجزیہ کرے۔ ان کی مُشترک خصُوصیات کو انشائیے کی
خصُوصیات قرار دینے میں بُخل سے کام نہ لے۔

مجھے اس موقع پر میتھیو آرنلڈ کی بات یاد آرہی ہے کہ ادب میں ایک تخلیقی دَور ہوتا ہے۔ اور ایک تنقیدی دَور۔ تخلیقی دَور میں بہت ساری تخلیقات ہوتی ہیں۔ نئے نئے تخلیقی تجربات کیے جاتے ہیں۔ پھر ایک تنقیدی دَور آتا ہے۔ جو گذشتہ تخلیقی دَور کی تخلیقات کا گہرا تجزیہ کرتے ہوئے آئندہ تخلیقی دَور کے رہنما اصول وضع کرتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ انشائیے کا ایک تخلیقی دَور اب ختم ہونے والا ہے۔ اب تنقیدی دور کا آغاز ہونا چاہیئے۔ جس میں آئندہ انشائیہ تخلیق کرنے کے اصول وضع کیے جائیں۔

اب ذرا ان اقتباسات کو ذہن میں تازہ کیجیئے جو میں نے تھوڑی دیر قبل لکھے تھے۔ اور جیسے کہ آپ نے دیکھا کہ یہ انشائیے نامور انشائیہ نگاروں کے تھے۔ تو ان انشائیوں میں جو کچھ نہیں تھا وہ انشائیے کی لازمی خوبی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اگر یہ انشائیے کسی مخصوص تعریف پر پورے نہیں اُترتے تو وہ تعریف ناقص ہے نا کہ یہ انشائیے۔ اگر یہ انشائیے واحد متکلم میں نہیں ہیں تو واحد متکلم میں انشائیہ ہونا لازمی نہیں۔ اگر ان میں مقصدیت کہیں دَر آتی ہے تو مقصدیت انشائیے کی جُز بن سکتی ہے۔

اس طرح اگر ڈاکٹر وزیر آغا کے انشائیے "درمیانہ درجہ" میں Comparative method استعمال کیا گیا تو یہ انشائیے کا وصف ہو سکتا ہے۔

آئیے اب چند بُنیادی سوالات کا جواب موجود انشائیوں میں تلاش کریں۔ چند سوالات تو ایسے ہیں جن پر شدّت کے ساتھ بحث کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مثلاً کیا انشائیہ ایک صنفِ سُخن ہے؟ ہر ادبی جریدے میں انشائیے کی اشاعت کے بعد اس سوال کا جواز باقی نہیں رہتا۔ انشائیے کی اصطلاح کس نے ایجاد کی یا اوّلین انشائیہ نگار کون ہے۔ یہ تحقیق کے اچھے موضوعات ہیں۔ لیکن اس تحقیق کا براہِ راست انشائیے پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

ہاں یہ سوال اہم ہے کہ انشائیے کا جواز کیا ہے؟ اس کا جواب دینے سے

پہلے ہمیں ایک اور سوال کرنا پڑے گا۔ کہ ادب کی دیگر اصناف کا جواز کیا ہے؟۔ اگر اِن اصناف کا مقصد ذات کا کتھارسس ہے تو اِنشائیہ بھی ذات کا کتھارسس کرتا ہے۔ اِنشائیہ شاعری کی طرح سوز و گداز پیدا نہیں کرتا۔ قہقہے لگانے پر مجبور نہیں کرتا۔ ملتھے پر طنز کی سلوٹیں نہیں اُبھارتا خالص فلسفیانہ افکار سے طبیعت کو بوجھل نہیں کرتا۔ بلکہ Intellectual level پر Broad Vision کو کرتا ہے۔ کسی حد تک اُردو میں اسے وسعتِ نظر کہہ سکتے ہیں۔ اور آج کے دَور میں Vision کی وسعت ایک مسئلہ ہے۔ اور ہر شخص کی خواہش بھی۔ اِنشائیہ Vision کو اس حد تک وسیع کرتا ہے کہ ایک عرصے بعد قاری بھی Intellectual Style میں سوچنے لگتا ہے۔

اب آیئے آخری اہم سوال کی طرف کہ اِنشائیہ کیا ہے؟ میرے خیال میں انشائیہ انگریزی لفظ Essay کا مُتبادل نہیں یہ اس طرح کا مغالطہ ہے۔ جس طرح کا انگریزی اصطلاح Long-Short Story کا ترجمہ طویل مختصر افسانہ کرنے سے پیدا ہُوا۔ حالانکہ اس کا صحیح ترجمہ طویل افسانہ تھا۔ اس طرح Essay کے لٹریری معانی چُونکہ analytical اور Speculative ادبی مضمون ہے۔ لہٰذا ہم نے بھی اس کے معانی اِنشائیہ قرار دیئے۔ اور Essay کی ساری صفات اِنشائیے کے کھاتے میں ڈال دیں لیکن درحقیقت Essay معنوی طور پر بڑی وسیع اصطلاح ہے اور نثر میں کہانی کے علاوہ تمام اصناف کا احاطہ کرتی ہے۔ مثلاً critical essay، Educational essay، analytical essay، یا پھر بالحاظ تکنیک Historical essay، Comparative، Discriptive وغیرہ۔ میرے خیال میں اِنشائیہ قریب قریب light essay کا ترجمہ ہے۔ اور جس کی اہم شرط شگفتگیٔ تحریر ہے۔ یہ موضوع سے زیادہ اسلوب کا مسئلہ ہے۔ اِنشائیہ نگار چاہے Self کو Expose کرے، زندگی کو ذات کی چھلنی سے گذار کر لفظوں میں ڈھالے یا اشیا کو نئے زاویے سے دریافت

کرے لیکن یہ سب انکشافات وہ کرے شگفتہ انداز میں اس طرح یہ ایک تخلیقی سرگرمی ہوئی جو پڑھنے والے پر ایک خوشگوار Intellectual mood طاری کر سکتی ہے

ادبی نقاد عام طور پر انشائیے میں ذات کے چھپے گوشوں کے اظہار اور Self کی اہمیت پر زور تو دیتے ہیں لیکن ان کا مفہوم متعین کرتے وقت اُلجھ جاتے ہیں۔ انشائیے میں ذات کے چھپے گوشے Self سے زیادہ زندگی کے ساتھ مربوط ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ انشائیے میں ایک تخلیقی عمل کے ذریعے زندگی اور Self یکجا ہو جاتے ہیں تخلیقی عمل اگر صرف ذات تک محدود ہو جائے تو وہ صرف آپ بیتی بن جائے گا۔ اگر Self زندگی سے connect ہو جائے تو آپ بیتی جگ بیتی کا روپ دھارے گی۔ اُردو انشائیے میں جہاں بھی Self کی ٹیکنیک استعمال ہوئی ہے وہاں Self اظہار کا مقصد نہیں بلکہ ذریعہ بنا ہے۔ اِس لئے کہ Self لامحدود وسعت رکھتا ہے۔

یہاں میں حوالہ دینا چاہوں گا سلیم احمد کے ایک مضمون کا۔ جس کا عنوان تھا "الف ۔ میں اور شام کا وعدہ" اس کا بنیادی thesis یہ تھا کہ میں آج الف اور ب دو مختلف لوگوں سے مِلنا چاہتا ہوں لیکن جو میں الف سے مِلوں گا وہ اُس "میں" سے مختلف ہو گا۔ جو "ب" کو ملنا چاہتا ہے۔ اس طرح تو ایک اِنسان کے اندر ہزاروں مختلف اِنسان چھپے ہیں۔ یہ ایک "میں" نہیں ہزاروں "میں" ہیں۔ جو ایک دُوسرے سے مختلف ہیں۔ سلیم احمد کے مُطابق Self صرف اپنی ذات نہیں بلکہ ہر لمحے کے تجربات کی روشنی میں نئی "میں" ہے جو Self میں اُجاگر ہوتی ہے۔ اَب اِنشائیہ نگار جب واحد متکلم میں بات کرتا ہے۔ تو وہ شگفتہ انداز میں اپنی سوانح تحریر نہیں کرتا بلکہ اس کا Self ساری کائنات اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے۔

جدید انشائیے کی روشنی میں ایک بات اور بھی کہی جا سکتی ہے کہ اس کی تخلیق میں جہاں شگفتہ اسلوب، Self کی وُسعت اور تخلیقی عمل کارفرما ہیں وہاں یہ Association of Thought کا بہترین استعمال بھی ہے۔ مثال کے طور پر سلیم آغا کا اِنشائیہ "انگلیاں"

تلازمۂ خیال کی عمدہ مثال ہے۔ انگلیوں کا دائرہ تمام امکانی تلازمات کے سہارے وسعت اختیار کر لیتا ہے۔ جیسے اگر میں پھول پر انشائیہ لکھنا چاہوں اور ذرا اس پر غور کروں تو پھول کے ساتھ کلیوں اور کونپلوں تک دماغ کی رسائی ہوگی۔ ذرا مزید سوچنے پر پتّوں، شاخوں اور کانٹوں کا حوالہ آئے گا۔ پھر گل چیں، باغباں، خزاں، بہار، بادِ صبا، بادِ نسیم کے تلازمات۔ الغرض میں پھول کے تمام متعلّقات کو تھوڑی سی ذہنی کاوش سے تلاش کر سکتا ہوں۔ اور اگر ان تلازمات کو تخلیقی اور شگفتہ اسلوب میں ڈھال دوں تو انشائیہ وجود میں آ سکتا ہے۔ اس طرح میں محسوس کرتا ہوں کہ انشائیہ لکھنے میں شعور کی رو کا عمل دخل زیادہ ہے۔ "Russell" نے ذہن کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انسانی شعور، لاشعور کی طرح دو حصّوں پر مشتمل ہے۔ ایک اجتماعی شعور ہے اور دوسرا مرکزی شعور۔ مرکزی شعور تو یہ ہے کہ میں اس وقت مضمون پڑھ رہا ہوں اور اجتماعی یہ کہ میں اپنے سامنے بیٹھے سامعین کے Response کو محسوس کر رہا ہوں۔ اہم انشائیہ نگاروں کے بارے میں بھی سوچ رہا ہوں اور ہال کی دیگر اشیاء کا تصوّر بھی مجھے ہے۔ اس طرح مرکزی شعور تو انشائیے کا اصل موضوع ہوتا ہے۔ اور اجتماعی شعور کا مواد تلازمات کے ذریعے اصل موضوع کو زرخیز کر دیتا ہے۔

ہو سکتا ہے طوالت کے خوف سے میں اپنی بات زیادہ واضح نہ کر سکا۔ لیکن یہ میرا خیال ہے اور میرا خیال غلط بھی ہو سکتا ہے۔ کہ انشائیے میں تلازمۂ خیال اور شعور کی رو جیسی Techniques استعمال ہوتی ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا بحیثیت انشائیہ نگار

—— خورشید ناظر

گذشتہ دنوں ڈاکٹر انور سدید کا ایک مضمون نظر سے گزرا جس میں انشائیے کے سلسلے میں ہونے والے مباحث کو موضوع بنایا گیا تھا۔ ہر چند میرے مقالے کا موضوع ڈاکٹر وزیر آغا کی انشائیہ نگاری ہے لیکن میرے خیال میں یہ بات ہر اُس نقاد کی جو وزیر آغا کے فن و شخصیت کا جائزہ لینا چاہتا ہے مجبوری بن گئی ہے کہ وہ وزیر آغا پر انور سدید کے لکھے گئے سبھی مضامین کا مطالعہ کرے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اپنے مقالے کا آغاز انور سدید ہی کے مضمون سے کیا ہے۔ جنہوں نے ڈاکٹر وزیر آغا کو اُن کے بار ہا انکار کے باوجود انشائیے کا بانی قرار دیا ہے۔ میں نے ہر طرح سے کوشش کر لی ہے کہ اُس اصولِ نقد تک رسائی حاصل کر سکوں جو انور سدید کے عقیدت بھرے خیالات کی تائید کرے لیکن میری کوشش ہر بار بے ثمر رہی۔ میری اِس ناکامی کے پس منظر میں یقینی طور پر وہ ان گنت دلائل کار فرما ہیں جن کا بیان یہاں زوائد کے ذیل میں آتا ہے۔ میں جب جب یہ بات سوچتا ہوں کہ کیا کسی تخلیق کار کے عظیم ہونے کے لئے اُس کا کسی صنفِ ادب کا بانی ہونا ضروری ہے تو تاریخ ادب جواب دیتی ہے کہ اگر یہ ضروری ہوتا تو انیس مرثیے اور میر و حافظ غزل کے عظیم ترین تخلیق کار نہ سمجھے جاتے۔ میری رائے ہے کہ جس طرح انیس سے

قبل بھی مرثیہ کہا جا رہا تھا لیکن جب ہم مرثیہ نگاری کے ذیل میں بحث کرتے ہیں تو انیسؔ ہمیں ایک ایسے مینار کی طرح ایستادہ دکھائی دیتا ہے جس کے نظارے کے بغیر شہرِ مرثیہ کا منظر بے وقعت ہو کر رہ جاتا ہے، اسی طرح انشائیے میں وزیر آغا کا یقیناً وہی مقام ہے جو مرثیے میں انیسؔ کا ہے کیونکہ وزیر آغا نے اِس صنفِ ادب کو پروان چڑھانے اور منوانے کے لیے بہت محنت کی ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اُنہوں نے انشائیہ کے سلسلے میں ایک عالم باعمل کا کردار ادا کیا ہے۔ اگر مَیں اپنے مقالے کے اِس موڑ پر جہاں میں وزیر آغا کی انشائیہ نگاری پر بحث کرنے والا ہُوں، اُن کے ایک کامیاب انشائیہ نگار ہونے کی اُس بنیاد کے راز کو منکشف کرتا چلوں جس پر اُنہوں نے اپنے انشائیے کو استوار کیا ہے تو شاید ہمیں وزیر آغا کے فن کو سمجھنے میں سہولت میسّر آجائے۔
مَیں سمجھتا ہُوں کہ وزیر آغا ایک عُمدہ منصُوبہ ساز ذہن رکھنے والے تخلیق کار ہیں جنہوں نے جدید انشائیہ کو آگے بڑھانے کے لیے یہ ضروری سمجھا کہ پہلے وہ انشائیہ کے تنقیدی خدوخال واضح کرنے کی کوشش کریں۔ اس لیے اُنہوں نے اپنے انشائیہ نگار ہونے سے پہلے ادب اور ادیب میں جدید انشائیے کو سمجھنے کے لیے ایک خاکہ ترتیب دیا۔ مَیں اِس بات سے تو شاید اتفاق نہ کرسکوں کہ ادب اور ادیب نے اس خاکے کو من وعن درست تسلیم کر لیا ہے لیکن یہ بھی بڑے کمال کی بات ہے کہ اب جب جدید انشائیے پر کسی بھی نوع کی گفتگو ہوتی ہے تو گفتگو کو آگے بڑھانے کے لیے اُس کے خاکے کی اہمیت کو بہر طور نظرانداز نہیں کیا جاتا۔
رہی یہ بات کہ آخر انشائیہ کا بانی کون ہے تو اُردو ادب کی معلوم تاریخ سے مجھے ڈاکٹر وحید قریشی کی یہ رائے معتبر لگتی ہے کہ انشائیے کے ابتدائی نمُونے دلّی کالج کے اساتذہ اور طالبِ علموں کے اُن مضامین میں بے حد توانا شکل میں موجُود ہیں جو اِن مضامین کو مشق کے لیے تحریر کیا کرتے تھے۔ ان مضامین کے بعد سر سیّد احمد خاں نے ہندوستان کی معاشرت کی عکاسی کرتے ہُوئے جو مضامین تحریر کیے اُنہیں بڑی حد تک اُردو انشائیے کے مکمّل اور کامیاب نمُونے قرار دیا جاسکتا ہے۔ ان مضامین میں 'خوشامد'، 'اُمّید کی خوشی' اور 'گذرا ہُوا زمانہ' خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ مَیں

انور سدید سمیت کسی بھی نقاد کے ان خیالات کی تائید کرنے سے بصد ادب و نیاز قاصر ہوں جن کے مطابق وزیر آغا نے کیونکہ شعوری طور پر انشائیہ نگاری کی، اس لیئے وُہ اس صنفِ ادب کے بانی ہیں جب کہ دُوسرے تخلیق کار اس بات سے ناواقف تھے کہ وُہ کیا تحریر کر رہے ہیں۔ اس لیئے اس اعزاز کا حق انہیں نہیں پہنچتا۔ اگر ہم اعزازات کے لیے شعوری کوشش ہی کو معیار ٹھہرانے لگیں تو ہمیں ان گنت لوگوں کو اُن اعزازات سے محروم کرنا ہوگا۔ جنہیں ہم متفقہ طور پر پہلے ہی ان کا مستحق قرار دے چکے ہیں مثلاً کولمبس کو امریکہ کی دریافت کے اعزاز سے اور الیگزینڈر فلیمنگ کو پنسلین کی دریافت کی فضیلت سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ قصّہ مختصر، جب ہم اس بحث میں پڑے بغیر کہ انشائیے کا بانی کون ہے، وزیر آغا کی انشائیہ نگاری کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں وُہ کئی حوالوں سے اس صنفِ ادب پر حاوی تخلیق کار دکھائی دیتے ہیں۔

ہر چند کہ کوششِ بسیار کے باوجود اب تک اہلِ دانش انشائیے کی تعریف کے تعین میں کامیاب نہیں ہو پائے۔ لیکن بعض باتوں پر اتّفاق اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ یہ کٹھن سفر عنقریب طے ہونے والا ہے۔ انشائیہ ایک ایسی نثری تخلیق کا نام ہے جس کی وحدت میں کثرت کا جلوہ دکھائی دیتا ہے۔ موضوعات کے تنوع اور عمومیت کے علاوہ اس کا اندازِ تحریر ہلکا پھلکا ہوتا ہے، یہ ایک داخلی اور شخصی صنفِ سخن ہے۔ اور اس کا تخلیق کار اپنے موضوع پر سنجیدہ بحث و مباحثہ کرنے اور دُوسروں کو مرعوب کرنے کے لیئے دلائل کا انبار لگانے کی بجائے موضوع کے بارے میں صرف اپنے تاثرات اور محسوسات پر اکتفا کرتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے قاری کے لئے ایک ایسا احساسِ تشنگی چھوڑ جاتا ہے جس کے زیرِ اثر وہ اُس موضوع پر مزید غور و فکر کرتا ہے۔ یہ وہ باتیں ہیں جن پر تقریباً سبھی نقاد اتّفاق کرتے ہیں۔ جب ہم ان باتوں کی روشنی میں وزیر آغا کے فن کا جائزہ لیتے ہیں تو وُہ ہمیں اکثر و بیشتر ان کی تکمیل کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

وزیر آغا ایک ایسے تخلیق کار ہیں جن کی تخلیق کی جہتیں چہار جانب پھیلی ہُوئی ہیں کہیں

حیران کُن بات ہے کہ جب وہ نظم تخلیق کرتے ہیں تو اُس میں وحدت کو اس قوت سے اپنی گرفت میں رکھتے ہیں جس سے احساس ہونے لگتا ہے کہ وہ اس کے اثر سے کبھی باہر نہیں آ سکیں گے۔ لیکن جب وہ انشائیے کی تخلیق کا عمل شروع کرتے ہیں تو اپنے ہر فن پارے میں وحدت میں کثرت کا عمل نہایت فن کارانہ صلاحیت سے بروئے کار لاتے ہیں۔ یہ وہ کٹھن عمل ہے جو زندگی میں گہری اور طویل ریاضت کے بغیر ممکن نہیں کیونکہ اس عمل کو مرکز گریز قوت سے مشابہ ایک ایسے طریقے سے مکمّل کرنا ضروری ہے جس میں خیالات بظاہر مرکز سے گریزاں نظر آئیں لیکن اُن کا رابطہ ہمہ وقت مرکز سے قائم رہے۔ میرے خیال میں اب تک جو انشائیے ادبی منظر نامے میں جگہ پا سکے ہیں ان میں وزیر آغا کے انشائیے اس خصوصیت کی مکمّل پاسداری کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ یہاں انشائیے کی اس خصوصیت کی حامل کچھ مثالیں وزیر آغا کی تخلیقات میں سے پیش کی جائیں لیکن اس کے لیے مکمّل انشائیے کا درج کیا جانا ضروری ہے جس کے نہ تو آپ اور نہ ہی یہ مختصر مقالہ متحمّل ہو سکتا ہے۔

وزیر آغا نے اپنے فن کی اساس اپنی دھرتی پر رکھی ہے۔ اُن کی تخلیقات پڑھتے ہوئے ہمیں جہلم اور چناب کے میٹھے پانی اور اپنی خوشبوؤں کے ساتھ حلق کو معطّر کرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ لہلہاتے کھیتوں، جھومتی ڈالیوں، رنگا رنگ فصلوں، رقص کرتے ہوئے کھیتوں اور دھرتی کے سینے سے اُٹھنے والی خوشبوؤں نے اُن کی تحریروں میں یُوں بسیرا کر رکھا ہے کہ جن سے کُشادگی کا احساس ہوتا ہے۔ بسنت میں کہتے ہیں۔

> "بسنت سرسوں کا تہوار ہے۔ یہ سرسوں کے کروڑوں، اربوں پھولوں کا میلہ ہے مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ سرسوں کا رنگ صرف کھیتوں تک ہی محدود نہیں ہوتا بلکہ کھیتوں کی مینڈھ پر چلتی ہوئی دوشیزہ کے عارضوں میں بھی جھلکتا ہے اور کھیتوں میں ہل چلاتے ہوئے کسانوں کے جسموں سے بھی پھوٹتا ہے۔
> پھر ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ یہ آسمان کے آئینے میں بھی منعکس ہونے

لگتا ہے" ——— اِسی انشائیے میں آگے چل کر کہتے ہیں۔

"ہر موسم میں زمین اپنا چولا بدلتی ہے اور چولے کے رنگ ہی سے پہچانی جاتی ہے، مگر یہ رنگ زمین سے بُری طرح چمٹا ہوتا ہے۔ بسنت کی خُوبی یہ ہے کہ اِس میں رنگ زمین سے دامن چُھڑا کر آسمان کی طرف پرواز کرتا ہے۔"

وزیر آغا نے اِنشائیہ نگاری کے میدان میں موضُوعات کے تنوع اور عمومیت کا بہر لحاظ خیال رکھا ہے۔ اُنہوں نے ایک طرف جھگڑا، لحاف، بہادری، خاموشی، آندھی، گرمی، دُھند، بسنت، تنہائی، دیوار، لاہور، بارھواں کھلاڑی، سیّاح اور قُطب مینار پر اپنی فنّی چابکدستی کا اظہار کیا ہے تو دُوسری طرف کچھ علالت کی حمایت میں، ڈبویا مجھ کو ہونے نے، کچھ خوبصورتی کے بارے میں، چوری سے یاری تک، ریلوے ٹائم ٹیبل، آگ تاپنا، طوطے پالنا اور حقّہ پینا جیسے موضُوعات کو حیران کُن زاویوں سے اپنی گرفت میں لیا ہے۔ موضُوعات کے اس تنوّع سے یہ بات کُھل کر سامنے آتی ہے کہ وہ زندگی کے صِرف بظاہر اہم پہلوؤں پر ہی نظر نہیں رکھتے بلکہ وُہ ان بظاہر غیر اہم پہلوؤں کی اہمیت سے بھی پُوری طرح واقف ہیں جنہیں عام لوگ سطحی انداز میں دیکھتے ہُوئے گُذر جاتے ہیں۔ میرے خیال میں مُشاہدے کی گہرائی جہاں ایک طرف تخلیق کار میں تخلیقی نمُو کا سبب بنتی ہے وہاں دُوسری طرف وہ اُسے کسی شے کے باطن تک اُترنے کی صلاحیت بھی عطا کرتی ہے۔ جب تخلیق کار یہ صلاحیت حاصِل کر لیتا ہے تو ایک غیر محسوس طریقے سے اثباتِ فطرت کے مسرور کُن عمل کے اثر میں آجاتا ہے۔ یہی وُہ موڑ ہے جہاں وُہ اپنی شخصیّت کے داخلی زاویوں کو دیانتداری سے اُجاگر کرنا شرُوع کر دیتا ہے۔ مَیں یہ محسُوس کرتا ہُوں کہ وزیر آغا انشائیے کے ذیل میں اپنی توفیق کے مُطابق ایک سچے امانت دار کا کردار بہت خُوبی سے نبھا رہے ہیں اور وہ اِس صِنف کے شخصی اور داخلی حوالے پر ایسی دسترس رکھتے ہیں جو کسی دُوسرے تخلیق کار کے حصّے میں اِس توانائی سے نہیں آئی۔

اِنشائیے کے ذیل میں اِس بات سے تقریباً سبھی نقّاد اتّفاق کرتے ہیں کہ اِنشائیہ

اپنے تخلیق کار سے ہلکے پھلکے اندازِ تحریر کا تقاضا کرتا ہے۔ انشائیے کے اس تقاضے کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے جب ہم وزیر آغا کے فن پاروں کا جائزہ لیتے ہیں تو وہ ہمیں اکثر و بیشتر اس تقاضے کو پورا کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں لیکن بعض اوقات وہ اس اندازِ تحریر پر اپنی گرفت قائم نہیں رکھ پاتے اور اُن کی تحریر اپنی روایتی روانی سے ہٹ کر قدرے ثقالت کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ ایک جگہ وہ تحریر کرتے ہیں۔

"میں جب اپنے دیہاتی باغیچے میں گھومتا ہوں یا گیہوں کے کھیتوں میں گھٹنوں تک دھنس جاتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے میں اپنی جنم بھومی، اپنی مادرِ وطن کے نرم و گداز آغوش میں واپس آگیا ہوں اور میری رفتار جو شہر کے تحرک و تموج اور افکار کی تندی اور وحشت کے باعث تیز ہوگئی تھی، پھر سے مدھم ہو کر فطرت کی مخصوص رفتار کے ساتھ ہم آہنگ ہوگئی ہے۔"

اپنے انشائیے بے ترتیبی میں کہتے ہیں۔

"ہر چیز ایک غیر فانی ترتیب میں ڈوبی ہوئی کسی صوفیانہ استغراق میں گم، زمان و مکان کی سرحد کو عبور کر چکی ہے۔ مجھے کمرے میں آتے ہوئے خوف محسوس ہوتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے میں نے اگر کسی شئے کو ہاتھ لگایا تو دفعتاً اس الف لیلوی ماحول کے کسی معطر پردے سے کوئی چمکتا ہوا خنجر برآمد ہوگا اور میرے سینے میں پیوست ہو جائے گا یا جیسے میرے داخل ہوتے ہی پردۂ غیب سے تحکم آمیز لہجے میں "خبردار" کا نعرہ بلند ہوگا اور میں پتھر کے بت میں تبدیل ہو جاؤں گا۔ یہ ترتیب، سلجھاؤ، یہ تغیر نا آشنا کیفیت، موت کے سے انجماد کا نقشہ پیش کرتی ہے اور میرے احساسات بھی پابہ زنجیر ہونے لگتے ہیں۔ میں خود بھی کمرے کا ایک حقیر سا بے روح جزو ہو کر رہ جاتا ہوں۔"

اسی طرح وزیر کے بعض انشائیے پڑھنے کے بعد زیرِ لب تبسم کی وہ کیفیت جو قاری

کو بوجھل ہونے سے تا حدِ امکان بچانے کی کوشش کی ہے۔ اُنہوں نے اپنے اِنشائیوں میں ایک مُسرّت زا اور لطیف کیفیّت پیدا کرنے کے لئے طنز و مزاح کے بے وقعت روایتی حربے کا استعمال نہیں کیا بلکہ اِس مُشکل کام کو اس طرح اِنجام دیا ہے کہ شائستگی کا دامن اُن کے ہاتھ سے کہیں بھی نہیں چھُوٹتا — وہ "چوری سے یاری تک" میں کہتے ہیں۔

"چوری ہمارا پیشہ ہی نہیں مشغلہ بھی ہے اور ہم نے لیل و نہار کی ہزار کروٹوں کے باوجُود نہ صِرف اسے زندہ رکھا ہے بلکہ اِس میں لاتعداد موشگافیاں اور فنّی باریکیاں بھی پیدا کی ہیں — دروغ بر گردنِ راوی، لیکن یہی سُنا ہے کہ ہمارے اِس پیشے کا ذکر رگ وید میں بھی موجُود ہے۔ آریا جب ہم پر حملہ آور ہُوئے اور ہمارے قلعوں کو برباد کرتے چلے گئے تو جواباً اور انتقاماً ہم نے بھی ان کے مویشی چرانے شروع کر دیئے۔ وہ سارا دن لڑنے بھڑنے کے بعد جب رات سمے آرام کرتے تو ہم شب خُون مار کر اُن کے مویشی اُڑا لے جاتے۔ یقین جانو، ہم نے اُنہیں اس قدر پریشان کیا کہ وُہ اپنے شلوکوں میں برکھا اور دُودھ اور فرزند کے لئے دُعائیں مانگنے کی بجائے ہمیں بد دُعائیں دینا شرُوع ہو گئے ——"

وزیر آغا کے انشائیے "حقّہ پینا" سے اقتباس دیکھئے۔

"جب آپ سگریٹ سلگا کر اُس کے نیلے نیلے مرغولوں کے جال میں محبُوس ہو جاتے ہیں تو آپ کے اور کمپارٹمنٹ میں سفر کرنے والے مسافروں کے درمیان غیریت کا ایک پردہ سا آویزاں ہو جاتا ہے جو اشتراک اور بھائی چارے کے بین الاقوامی مؤقف کی صریحاً خلاف ورزی ہے جب کہ حُقّہ کا شغل اختیار کرتے ہی آپ کو محسوس ہوتا ہے کہ جیسے چاروں طرف سے نیم وا آنکھیں آپ کو پیار سے گھُورنے لگی ہیں اور جسموں میں بے وجہ سی کسمساہٹ ہونے لگی ہے۔ معاً کوئی جانِ ناتواں آپ کی طرف آہستہ آہستہ کھسکتی ہے حتّیٰ کہ

پر پہلے سے موجود ہوتی ہے، ختم ہو کر رہ جاتی ہے اور وہ اس لطیف کیفیت کی حدوں سے نکل کر تفکر کی حدوں میں داخل ہو جاتا ہے۔ میرے خیال میں قاری میں یہ تبدیلی شاید ایسی تحریروں کو پڑھ کر ہی پیدا ہوتی ہے جنہیں فلسفیانہ تحریریں کہا جانا چاہیئے۔ میری رائے ہے کہ انشائیہ اس اندازِ تحریر کا ہرگز متحمل نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہے بعض نقّاد اظہارِ دانش کے اِس بالواسطہ طریقے کو انشائیے کے لیے سُودمند تصوّر کرتے ہوں لیکن میرے نزدیک یہ عمل کان کنی کے عمل سے کسی طرح کم مشکل نہیں کہ کوئی انشائیہ نگار یہ توقّع کرے کہ اُس کا قاری اُس کی تحریر سے وہ معانی دریافت کرے جو تخلیق کار کے ذہن کے تہہ خانے میں پوشیدہ ہیں۔ وزیر آغا کے انشائیوں میں کئی جگہ یہی صورتِ حال پیدا ہو گئی ہے۔ اُنہوں نے اپنے انشائیوں میں بعض دفعہ دلائل دینے کے عمل کو بھی شاید لاشعوری طور پر اپنا لیا ہے جس سے اُن کے اپنے تاثرات اور محسُوسات پر اکتفا کا عمل رُک سا گیا ہے۔ اس سلسلے میں اُن کے کئی انشائیوں کا حوالہ دیا جا سکتا ہے جن میں لاہور اور دیوار وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں —— ان تمام باتوں سے قطع نظر وزیر آغا ایک ایسا انشائیہ نگار ہے جس کی عظمت کو تسلیم نہ کرنا اپنے بخیل ہونے کا واضح ثبوت مہیّا کرنے کے مترادف ہے —— اُن کے تقریباً سبھی انشائیے اپنے اندر ان گنت خُوبیاں سمیٹے ہُوئے منظرِ عام پر آئے ہیں۔ اُنہوں نے اپنے انشائیوں میں اس بات کا اہتمام کیا ہے کہ اُن میں موضُوع کے اعتبار سے وحدت میں کثرت دکھائی دے۔ موضُوعات کے تنوّع کے باوصف اندازِ تحریر ہلکا پھلکا رہے۔ اُن کے انشائیے ایک داخلی اور شخصی صنفِ سُخن کے معیار پر پُورے اُتریں اور انہوں نے سوائے چند موقعوں کے اپنی بات کو آگے بڑھانے کے لیے مرعوب کُن دلائل دینے کی بجائے اپنے تاثرات اور محسوسات پر اکتفا کیا ہے۔

وزیر آغا نے انشائیے کے خدّوخال واضح کرتے وقت اُن کے بین السطور انشائیے کے لیے تخلیقی اُسلُوب تجویز کیا ہے جس کے لیے اُنہوں نے حسبِ ضرورت کہیں تمثیلی انداز اختیار کیا ہے اور کہیں علامت، تشبیہہ یا استعارے کا سہارا لینے کے باوجُود اپنے اندازِ تحریر

حُقّے کی نَے اُس کے مُنہ کی زد میں آجاتی ہے اور پھر آپ دیکھتے ہیں کہ کمپارٹمنٹ
کے سارے غنچہ دہن آپ کے گرد ایک دائرے کی صُورت میں جمع ہو گئے ہیں
ہیں اور آپ کا ہاتھ جس نے حُقّے کو تھام رکھا تھا بڑے پُراسرار مشینی انداز میں
حُقّے کی نَے گھمانے لگتا ہے اور نَے بیچاری ایک غار سے نکلنے اور دُوسرے
میں گھُسنے کے طویل عمل کے بعد بار بار آپ کے دہن مُبارک میں پہنچ رہی ہے۔
تب آپ کو محسوس ہوتا ہے کہ جیسے آپ نے دُنیا جہان کے اِنسانوں سے
رابطہ اور بھائی چارہ پیدا کر لیا ہے۔ حُقّہ مجتمع کرتا ہے، مفاہمت اور
محبّت کو جنم دیتا ہے ــــ ایک دُوسرے کے دُکھ درد کو سمجھنے کے مواقع
فراہم کرتا ہے۔ تنہائی کے کربناک احساس سے نجات دلاتا ہے اور سب
سے بڑی بات یہ کہ نفرت کی دیواروں کو مسمار کرتا ہے۔ مثلاً جب حُقّے کی
نَے آپ کے قریب ترین بیٹھے ہُوئے کرم فرما کے سیاہ، متعفّن اور موٹے ہونٹوں
کو چھُو کر آپ کی طرف لَوٹتی ہے اور آپ اُسے ڈیٹول سے دھوئے بغیر اُس
پر اپنے نازک ہونٹ ثبت کر دیتے ہیں تو اُس کا صاف مطلب یہ ہے کہ
آپ نے ایک تابندہ لمحے میں اپنے جُملہ قبائلی، نسلی اور جماعتی تعصّبات کو
ختم کر کے اِنسانی اُخوّت اور عالمی برادری کے احساس کو پروان چڑھا
دیا ہے۔"

یہ اللہ کی دین ہے کہ وزیر آغا نے نظم و نثر دونوں میں بے پناہ لکھا۔ اُنہوں نے
جس صنفِ ادب میں طبع آزمائی کی، اُس کے تمام تقاضوں کو پیشِ نظر رکھا۔ اُنہوں نے وافر
مقدار میں اِنشائیے تحریر کیے لیکن تعداد کی کثرت کے باوجُود اِس صنفِ ادب کے لیے جس
معیار کا تعیّن کیا اُس سے دانستہ طور پر کہیں انحراف نہیں کیا۔ اُن کے اِنشائیے اہم اِنکشافات
کے حامل ہوتے ہیں جن کا اُسلُوب عام طور پر سادہ، شگفتہ اور پسندیدہ ہوتا ہے۔ وُہ ایک

ایسے تخلیق کار ہیں جن میں یہ کمال پیدا ہو گیا کہ وُہ خیالات کے دھاگوں کو اُلجھنے سے بچائے رکھنے کی دیانتدارانہ کوشش کرتے ہیں اور اِس طرح اُن کی تحریروں میں ایک ایسی ندرت، فکری عمدگی، تہہ در تہہ معانی کے اظہار کی صلاحیت اور تازگی پیدا ہو جاتی ہے کہ ان کا قاری یہ سوچتا ہی رہ جاتا ہے کہ یہ ناممکن عمل اِس قدر سہولت سے کیسے ممکن ہو گیا ــــ وزیر آغا کے اِنشائیے کی انہی خصوصیات نے اِنشائیہ نگاروں کی ایک ایسی معتبر جماعت پیدا کر لی ہے جس نے نہ صِرف خُود کو بلکہ انشائیے کو بھی ایک معتبر صنفِ ادب تسلیم کرا لیا ہے۔

اِنشائیے پر بات

محمّد رشید الزمان

آسکر وائلڈ نے کہیں کہا ہے کہ دُنیا کو آگے بڑھنے سے روکنے کے لیے صرف ایک ہی پابندی کافی ہے کہ کوئی بھی ایسی بات نہ کرے جس سے دُوسروں کے جذبات مجروح ہوتے ہوں۔ یہ جذبات بہت نازک چیز ہیں۔ ذراسی بے احتیاطی سے تڑک جاتے ہیں۔ ان نازک آبگینوں کو ٹھیس نہیں لگنے دینی چاہیئے۔ مگر کیا کروں کہ ارسطو کی یہ بات بھی دل کو بھلی لگتی ہے کہ افلاطون مُجھے عزیز ہے مگر صداقت عزیز تر، اِس لِئے جس چیز کو سچ سمجھتا ہُوں اُس کی خاطر کبھی کبھی کُچھ اختلاف بھی کر لیتا ہُوں۔ مگر کوشش یہی رہتی ہے کہ کسی کی دل آزاری نہ ہو، مگر انشائیے پر بات کرنی کُچھ ایسی ہی مُشکل ہو گئی ہے کہ رواداری اور حق گوئی ایک ساتھ چلتے دکھائی نہیں دیتے۔ اِس لِئے اگر کہیں ہاتھ سے شاخِ زیتون گرتی یا امن کی فاختہ چھُوٹتی نظر آئے تو اِسے محض راستے کی دُشواری سمجھا جائے نہ کسی کی طرف داری۔ البتہ اپنی دیانتدارانہ رائے ایک ایسا فریق ضرور ہے جس کی حمایت پر ندامت یا معذرت آج کی اِس محفل میں موجود اہلِ علم اور اہلِ ادب کے ساتھ ایک زیادتی ہو گی۔

اِنشائیے پر بات کرنے کی یہ مُشکل خُود ڈاکٹر وزیر آغا نے جمیل آذر کے اِنشائیوں کے مجموعے

"شاخِ زیتون" پر اظہارِ رائے کرتے ہوئے بیان کی ہے کہ

"انشائیے پر سنجیدہ بحث کرنے کی بجائے بعض لوگوں نے اِنشائیہ نگاروں اور اِنشائیہ نگاری کا مذاق اُڑانا شروع کر دیا ہے۔"

مجھے اس بات کی خوشی ہوئی کہ ڈاکٹر صاحب اِنشائیہ پر سنجیدہ بحث کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ اُن کی اِس تحریر سے ایک تاثّر یہ اُبھرتا ہے کہ یہ سنجیدہ بحث خود انشائیہ کے اُسلوب یا ہیئت میں ممکن نہیں۔ اِس لیے میں نے اِحتیاط کے طور پر اپنی گفتگو کا عنوان "انشائیے پر بات" رکھا ہے کہ بحث ایک بہت ثقیل چیز ہے اور خود اِنشائیہ والے اس کے بہت خلاف نظر آتے ہیں۔ مگر جہاں تک سنجیدگی کا تعلق ہے اِس کا اِنشائیہ سے کوئی تضاد نہیں کہ مونتین اور بیکن سے لیکر جیمز تھربر تک اِس کو اِس قدر ہلکا پھلکا نہیں بنا سکے کہ اِس کا کوئی وزن ہی نہ رہا ہو۔ مگر یہ تحقیق طلب بات ہے کہ اِنشائیہ سے متعلق اُردو تنقید کا ماحول کیوں اس قدر خراب ہو گیا ہے کہ فضا واقعی کچھ خندہ و استہزا کی قائم ہو گئی ہے۔ اِس سوال کا جواب کسی حد تک آغا صاحب کے شکایت کے لہجے میں بھی مضمر نظر آتا ہے۔ وُہ یہ کہتے ہیں کہ اِس غیر سنجیدگی کی وجہ یا تو یہ ہے کہ اُن کے حریف۔ اِنشائیے میں۔ اتنے کُند ذہن ہیں کہ اِنشائیے کے مزاج اور تعریف کو نہیں سمجھتے یا پھر انشائیہ نگاری کے جوہر سے عاری ہونے کے باعِث بنجرپن کی حاسدانہ نفسیات کا شکار ہو گئے ہیں۔ یہاں اس کا موقع نہیں کہ ان کے مخالفوں کے اِس غیر دوستانہ رویّے کے محرکات کے دُرست یا نا درست ہونے کا محاکمہ کیا جائے مگر یہ بات کہے بغیر چارہ نہیں کہ خود ڈاکٹر صاحب کی طرف سے اور انشائیہ کے دُوسرے ایسے ہمدرد ناقدوں کی طرف سے اِنشائیہ پر جو سنجیدہ بحث کی گئی ہے۔ اِس کا معیار بھی کوئی زیادہ بلند نہیں رہا اور ان کی آرا سے بھی دُوسرے غیر ادبی اور شخصی قسم کے محرکات منسوب کیے جا سکتے ہیں۔

ہمارے ہاں ایک جھگڑا تو "باوا آدم کون ہے" کا کھڑا ہو جاتا ہے۔ مگر اُردو کی دُوسری اصناف کے مُقابلے میں اِنشائیہ کے سلسلے میں یہ جھگڑا کچھ زیادہ ہی سنگین صُورتِ حال اختیار

کر گیا ہے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ کافی حد تک باوا آدم بننے کی یہ بچگانہ یا پیرانہ خواہش اِنشائیے کی تعریف اور اِس پر سنجیدہ گفتگو میں رکاوٹ بنی ہُوئی ہے۔ اوّل ہونے کی خواہش میں انشائیہ کی تعریف کچھ اِس ڈھنگ سے کی جاتی ہے کہ صِرف وہی کچھ انشائیے کے دائرے میں آئے جو تعریف کرنے والے نے اب تک لکھا ہے اور خاص طور پر اِس کا اہتمام کیا جاتا ہے کہ اِس سے مِلتی جُلتی اور کسی چیز سے اس کا آخری تعلّق بھی توڑ دیا جائے۔ خاص طور پر اِس کو مضمون، طنز اور مزاح سے بالکل الگ کر دیا جائے کہ اِس میدان میں اور بھی جرّی موجُود نظر آتے ہیں۔

ایک بات جو ابتدا۔ میں واضح ہو جاتی ہے کہ خُود تعریف کی تعریف بھی بہت مجرّد اور غیر تاریخی اُسلُوب سے کی جاتی ہے۔ آخر تعریف کی تعریف کیا ہے؟ یہی نہ کہ یہ کسی مظہر کی، زیادہ سے زیادہ خصُوصیّات پر محیط ہو مگر اختصار کے ساتھ اور اگر مظہر تاریخی ہو جیسا کہ زبان و ادب اور ادب کی جُملہ اصنافِ نثر و نظم ہیں تو اِس تعریف کو ان کا ماخذ، تشکیل اور ہیئت کے تاریخی پہلو کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ دُوسرے لفظوں میں ادب اور اِس کے مظہرات کو ایک تاریخی تناظر میں رکھ دیکھنا چاہیئے۔ کیا آج ادب کی تعریف وہی ہے جو ارسطو کے نزدیک تھی تو پھر انشائیے کے سِلسلے میں یہ میکانکیت کیُوں؟ ڈاکٹر آغا کی فکر کی ایک پہچان یہ ہے کہ وہ اپنی تنقید میں خواہ وُہ اُردو شاعری کے مزاج کی بات ہو یا اِنشائیے کی تعریف کی، ایک جامد اور غیر تاریخی رویّہ اِختیار کرتے ہیں۔ اس کی مثال یہ ہے کہ وہ اپنے شاخِ زیتون والے مضمُون میں بھی اِنشائیے کے مزاج اور فطرت کی بات اِس طرح کرتے ہیں کہ جیسے یہ ایک ابدی اور غیر متبدل حقیقت ہو، فلاسفہ کا جوہرِ خالص۔ اِس پر بس نہیں پھر وُہ اس تعریف کے بل بُوتے پر انشائیہ کا رشتہ طنز اور مزاح سے توڑنے کی سر توڑ کوشش کرتے ہیں۔ مگر اس سنجیدہ سوال کا کوئی جواب نہیں دیتے کہ اگر اِس کا تعلق عالمِ امثال سے نہیں تو اس کی ابتدا۔ اور نشو و نُما بھی ہُوئی ہوگی اور اب اس کی کیا ہیئت ہے جس کی بُنیاد پر اس کو دُوسرے مماثل مظہرات سے ممیز کیا۔ جا سکتا ہے، خاص طور پر طنز اور مزاح سے۔ اور کیا ان کی پرچھائیاں اگر

اِنشائیے پر پڑ جائیں تو وہ نخالص ہو جاتا ہے؟ اتنی چھوت چھات تو منوجی مہاراج کے آریہ وَرت میں بھی نہیں پائی جاتی!

اِنشائیے کی ہیئت یا سٹرکچر، اگر کوئی ہے، کی بات تو کی نہیں جاتی۔ صِرف نقطۂ نظر پر زور دیا جاتا ہے وُہ بھی عجیب و غریب مثالوں سے، جِن میں سے چند ایک دلچسپی سے خالی نہیں۔ ان مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اِنشائیے کے علمبرداروں کا فلسفۂ علم اور اِس کی اساس نہایت کمزور ہے۔ آغا صاحب کا دعویٰ ہے کہ اِنشائیے میں اِنسان سامنے کی چیز کو ایک نئے زاویے سے دیکھتا ہے۔ کیا یہ نیا زاویہ دُوسری اصنافِ ادب کے لئے ممنُوع ہے۔ آگے چل کر وہ جمیل آذر کے اِنشائیوں پر بات کرتے ہُوئے کہتے ہیں کہ:

"وہ روزمرہ کی چھوٹی چھوٹی اشیاء، واقعات اور تجربات میں ایک جہانِ معانی دریافت کر لیتے ہیں۔ یہ جبھی ممکن ہے کہ اِنسان سامنے کی چیز کو ایک نئے زاویے سے دیکھے۔ مثلاً یا تو وہ چیز کو اِسکی جگہ سے ہلا دے تاکہ اِس کا ایک نیا رُوپ سامنے آجائے یا پھر خُود اپنی جگہ سے سرک جائے تاکہ وہ ایک نئے زاویے سے اِس پر نظر ڈال سکے۔ اکثر لوگ اِس اہم نکتے کو فراموش کر دیتے ہیں یا واقعہ کو خلقِ خُدا کے مانوس زاویے سے دیکھتے ہیں۔ اِس طرح بعض لوگ شے یا واقعہ کو ایک آنکھ میچ کر دیکھتے ہیں، اپنی جگہ سے سرک کر نہیں دیکھتے، چُنانچہ وہ طنزیہ، مزاحیہ مضمُون تو لکھ لیتے ہیں لیکن اِنشائیہ تخلیق نہیں کر پاتے۔ اِنشائیہ لِکھنے کے لِئے اپنی سیٹ کو لحظہ بھر کے لِئے چھوڑنا پڑتا ہے۔"

ایک دُوسری جگہ ایک اچھا اِنشائیہ لِکھنے کا کلیہ تجویز کرتے ہیں۔

"لیکن اگر آپ ان گھِسی پِٹی رائیوں سے الگ ہو کر ایک نئے زاویے سے سمندر کو دیکھنے کے متمنی ہیں تو آپ سمندر کی طرف پُشت کر کے کھڑے ہو جائیں اور پھر جُھک کر اپنی ٹانگوں میں سے سمندر کو دیکھیں تو آپ کو ایک ایسا منظر

دکھائی دے گا جو آپ سے پہلے شاذ ہی کسی کو نظر آیا تھا۔ ٹانگوں میں
سے سمندر کو دیکھنے کی یہ روش دراصل آپ کو دیکھنے کا ایک نیا زاویہ عطا
کرے گی جو دیکھنے کے مروج انداز سے آپ کو آزاد کر دے گا۔ اِس نئے
مقام کی تسخیر کے بعد آپ کے ہاں جو عجیب و غریب ردِ عمل مرتب ہوگا وہی
اِنشائیہ کی جان ہے۔"

اس نئے زاویے کو اِختیار کرنے کے لیئے ایک ماہر یُوگا کے اُستاد کی طرح مفصّل ہدایات
دی گئی ہیں۔ یہ ایک بات جس میں ان کے حلیفوں کا اُن کے ساتھ مکمّل اِشتراک ہے۔ سلیم آغا
قزلباش منتخب اِنشائیوں کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

"اِنشائیہ میں شرکت کے باوجُود اسے ایک تماشائی کا مقام حاصل ہوتا ہے
یہ ایک بالکل مختصر سالمحہ ہے جس میں اِنشائیہ نگار پُرسکُون ہو کر پُوری دُنیا
کو اپنی تیسری آنکھ سے دیکھتا ہے۔"

جدید اِنشائیے کے یہ جدید دعوے دار اپنے اِس نئے زاویے کو مہاتما بُدھ کے زاویے کے مثیل
قرار دیتے ہیں۔ لہٰذا سلیم آغا قزلباش ہی لکھتے ہیں۔

"میرے نزدیک اِنشائیہ نگار کی مثال مہاتما بُدھ کی سی ہے جو امارت اور
حکُومت کے ماحول کو چھوڑ کر جب برگد کے درخت کے نیچے آ بیٹھا اور
یُوں اُس نے زمانے کے بحرِ بے کنار میں ایک جزیرے کا رُوپ دھار
لیا اور اِس کے ہاں زندگی کو فاصلے سے دیکھنے کی قدُرت پیدا ہو گئی۔ یہی
آگہی کا وُہ لمحہ تھا جو اِنشائیہ کا اصل مزاج ہے۔"

گویا کہ اِنشائیہ کے اِس دبستان کے نزدیک وہ صفت جو اِسے دُوسری اصناف سے ممیز
کرتی ہے اور اِسے ایک خاص شخصیّت عطا کرتی ہے، وہ اِس کا نقطۂ نظر یا زاویۂ نگاہ ہے
جس کو گھُما پھرا کر چیز کو اس جگہ سے ہلا کر دیکھنا یا اپنی جگہ سے خُود سرک جانا یا سمندر کو دیکھنے

کے لیے سمندر کی طرف پُشت کر کے ٹانگوں کے درمیان سے دیکھنے کی
ترکیب سے حاصل کرتے ہیں"۔

اِنشائیہ میں زاویۂ نگاہ کی اِس تمام شاعرانہ گفتگو کا اگر نہایت ہمدردی سے بھی جائزہ لیا جائے اور لسانی تجزیے کے بے لاگ ہتھیار سے اِس کو نہ پرکھا جائے تو بھی مفہوم اِس سے زیادہ برآمد نہیں ہوتا کہ اِنشائیہ ایک تازگی کا حامل ہوتا ہے۔ یا پھر اِس کو ہونا چاہیئے اور یہ تازگی حقیقت کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے سے پیدا ہو سکتی ہے۔ مگر نئے مضامین اور تجربے کی تازگی کب دُوسری اصناف کے لِئے غیر ضروری ہے؟ اِس میں اِنشائیہ کی کیا تخصیص ہے؟ اگر ان تمام بیانات کو اِنشائیہ پر سنجیدہ گفتگو شمار کر لیا جائے اور ایسا نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں تو جدید انشائیہ کے ان جدید ناقدین کے ذہن کی حدُود و قیوُد جلدی ہی واضح ہو جاتی ہیں۔ یہ سب حضرات ایک فِکری مغالطے میں مُبتلا نظر آتے ہیں کہ تناظر، ناظر اور منظر سے کوئی الگ چیز ہے۔ تناظر ہر منظر کی حقیقت میں شامل ہوتا ہے اور زاویۂ نگاہ کو بدلنا اتنا سہل بھی نہیں ہوتا۔ اکثر اوقات اِس کے لِئے اجتماعی جد وجہد بھی کرنا پڑتی ہے جو خلقِ خُدا کے اشتراک کے بغیر ممکن نہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ آج فنُون میں، خاص کر پلاسٹک فنُون میں حقیقت کا جو جہتی ادراک پایا جا رہا ہے وُہ پُورے اِنسانی سفر کی پیداوار نہیں اور محض کِسی ایک سپُوت کے اپنی جگہ کو بدل کر کائنات پر نگاہ ڈالنے سے پیدا ہو گیا ہے۔

میرے نزدیک یہ نیا زاویہ، اپنے مقام سے سرک جانا یا چیز کو ہلا دینا۔ ٹانگوں کے درمیان سے سمندر کو دیکھنا، حقیقت کے بہتر ادراک کے لِئے تیسری اِنشائی آنکھ محض لفاظی اور لِسانی شعبدہ گری ہے۔

خلقِ خُدا کا مانوس سا زاویہ ہے کہ شجر اپنے ثمر سے پہچانا جاتا ہے۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ اِن جدید انشائیہ نگاروں کی اِس تیسری آنکھ نے کیا کیا منظر دکھائے ہیں اور حقیقت کے بہتر ادراک میں ہماری کیا رہنمائی کی ہے۔ وزیر آغا کے اِنشائیہ "دسترخواں" کو ہی لے لیجئے۔ یہ ایک

طرح سے گزرے زمانے کا نوحہ ہے کہ اس میں ان کو اپنے عزیز ترین ثقافتی ورثے کے پائمال ہو جانے کا غم ہے۔ پُرانے گاؤں کی خود کفالت کے برہم ہو جانے کا دُکھ ہے۔ دستر خوان زمین سے قریب کر دیتا ہے۔ لہٰذا میز کرسی زمین سے دُوری کی علامت ہیں۔ انشائیہ نگار نے جس زاویے سے اِس معاشرتی حقیقت کا نظارہ کیا ہے۔ یہ وہی رومانویت پسندوں اور ماضی پرستوں کا معروف سازاویہ ہے۔ روسو سے لے کر ڈی۔ ایچ لارنس تک بے شمار مفکروں اور ادیبوں نے معاشرے اور معاشرتی حقائق پر اس طرح نگاہ ڈالی ہے۔ مگر آغا صاحب کے اس ٹانگوں کے درمیان سے معاشرتی سمندر دیکھنے میں معاشرتی تنقید کے دو جزیے غائب ہیں جن کی وجہ سے یہ مُفکر اور ادیب ہمارے لِئے اہم ہیں۔ اِس کے برعکس فضا معمُولی پن کے گرد و غبار سے اٹی نظر آتی ہے۔

اِن کے دُوسرے انشائیے "چرواہے" میں چرواہے کی تصویر بھی رُومانی اور Pastoral روایت میں ایک چرواہے کی تصویر ہے جو یورپ میں نشاۃ الثانیہ کے بعد مصوری کا ایک جانا پہچانا Motif رہا ہے۔ امیر لوگ چرواہے کو گھر میں گھُسنے نہیں دیتے تھے۔ مگر اس موٹیف کی حامل تصاویر کو بڑے شوق سے دیواروں پر سجاتے تھے۔ جیسے ہمارے ہاں آج کل کھاتے پیتے گھرانوں کے ڈرائنگ روموں میں چھاج اور چرخے ٹنگے نظر آتے ہیں۔ چرواہے سے ایک اقتباس پیش ہے۔

"کسان بیچارے کو تو زمین نے جکڑ رکھا ہے اور بنئیے کو زر نے مگر چرواہا ایک آزاد مرد ہے۔"

ایک اور ٹکڑا ہے۔

"کہ تا حال اِنسانی تہذیب تین ادوار سے آشنا ہوئی ہے۔ پہلا چرواہے کا دَور جو گزر چکنے کے باوجود ابھی تک نہیں گزرا۔"

چرواہے کا دَور تو گزر چکا ہے مگر وہ اِس کے احیاء کی کوشش میں ہیں۔ اگرچہ گزرا ہوا دَور کبھی

واپس نہیں آتا۔ وہ زمین سے جکڑے اور زر سے بندھے بنئے پر اپنی نظر نہیں جماتے مگر چرواہے کے تعاقب میں سرگرداں ہیں۔ وہ اپنے اِنشائیے کا آغاز ہی اس طرح کرتے ہیں۔

"پچھلے ہفتے کی بات ہے۔ مَیں حسبِ معمول کھیتوں کا طواف کر رہا تھا کہ میری مُلاقات ایک چرواہے سے ہُوئی جو اپنی بھیڑوں کا ریوڑ قریبی پہاڑیوں کی طرف لے جا رہا تھا۔"

خیر چرواہا تو ابھی بھی ریوڑ کے ساتھ پہاڑیوں کی طرف جا رہا تھا مگر انشائیہ کا واحد متکلم حسبِ معمول کھیتوں کا طواف کر رہا تھا۔ لفظ طواف ہی اِس انشائیے کی تفہیم کی کلید ہے۔ طواف صِرف زمین سے آزاد ہو کر اور پیداواری عمل سے بچھڑ کر ہی کیا جاتا ہے۔ کِسی زائر کی یہ آزادی زمین کے پرچۂ ملکیت کے جیب میں ہونے سے پیدا ہوتی ہے۔

وزیر آغا اور اُن کے ہم خیال اِنشائیہ نگار اور تنقید کار ادب کی غیر جانبداری کے سختی سے قائل ہیں مگر اُن کی نگارشات میں اُن کے متنازعہ معاشرتی میلانات اور ترجیحات بوجھل جمالیاتی ستر پوشی کے باوجود عُریاں ہیں۔ وزیر آغا کہتے ہیں کہ۔

"ادب کی تخلیق کا عمل ایک قطعاً آزاد عمل ہے۔"

اُن کا یہ قول خُود ان کے لِئے بھی ایک طویل مُدّتی ادبی منشُور کا کام دے سکتا ہے۔

مَیں آخر میں اُس تیسری آنکھ کے سلسلے میں جس کا ذکر اُوپر اِس قدر ہو چُکا ہے یہاں پر اس ماہرِ حیوانات کا واقعہ بیان کِئے بغیر نہیں رہ سکتا جس نے بندروں کے معروضی مطالعے اور مُشاہدے کی خاطر ایک بندر پال رکھا تھا۔ پروفیسر موصوف مختلف زاویوں سے اِس جانور کی حرکات و سکنات کا مطالعہ کر چُکے تھے مگر اُن کو ٹوہ تھی کہ یہ محروم زنخداں مخلُوق تنہائی میں کیا کرتی ہے؟ اِس کے لِئے اُنہوں نے ایک ترکیب نکالی کہ انسان نما کو ایک دُوسرے کمرے میں ٹھہرا دیا اور خُود اپنے کمرے میں ایک خفیہ سوراخ سے اِس کا نظارہ کرنے لگے۔ مگر اُن کی حیرت کی اِنتہا نہ رہی جب اچانک اُن کی آنکھیں اپنے اِس پالتو کی آنکھوں سے

اُس سوراخ میں دوچار ہوگئیں۔ وہ بوزنہ اس سوراخ سے خُود پروفیسر صاحب پر اپنی نظرِ تجسّس گاڑے ہُوئے تھا۔

کہتے ہیں کہ یہ جانور ہر انسان میں کسی نہ کسی حد تک موجُود ہے۔ اِس لئے حقیقت کا اِس تیسری آنکھ سے مشاہدہ کرنے والوں کو چاہیئے کہ وہ جس تناظر سے بھی دیکھیں یہ نہ بھُولیں کہ وہ خُود بھی دیکھے جارہے ہیں۔

اِنشائیہ میں شگفتگی کا مفہوم

—— مشکور حسین یادؔ

ابھی پچھلے دنوں کی بات ہے، بہاول پور سے چند میل دُور لودھراں ضلع ملتان میں انشائیہ کانفرنس منعقد ہُوئی تھی۔ اِس کانفرنس میں جب میں اپنا اِنشائیہ پڑھنے لگا تو اِس سے پہلے میں نے کانفرنس کے شرکا، سے کہا کہ آپ میرے اِنشائیے کے یہ توقع ہرگز نہ رکھیں کہ آپ اِسے سُن کر مُسکرا اُٹھیں گے ہنسنا اور قہقہہ لگانا تو خیر بہت دُور کی بات ہے۔ مَیں نے یہ بات اِس لیئے عرض کی تھی کہ طنز و مزاح کو اِنشائیے کے ساتھ اِس طرح وابستہ سمجھ لیا گیا ہے، جیسے اِس کے بغیر انشائیہ وجُود ہی میں نہیں آسکتا۔ چلئے کسی تحریر میں طنز و مزاح کا در آنا ایسی کوئی بُری بات نہیں لیکن انشائیے کے ضمن میں مُشکل یہ آن پڑی ہے کہ طنز و مزاح کو انشائیہ کے ساتھ لازم و ملزوم کی حیثیت دے ڈالی گئی ہے۔ اور پھر یُوں لازم و ملزوم سمجھ کر اِنشائیہ کو ایک غیر سنجیدہ صنفِ ادب قرار دے ڈالا۔ اَب آپ کوئی اُلٹی پُلٹی بات کر ڈالیں یار دوست فوراً پکار اُٹھیں گے لیجئے جناب آپ کے لِئے اِنشائیے کا ایک موضُوع ہاتھ آ گیا۔ قلم اُٹھا لیجئے اور ایک اِنشائیہ لکھ ڈالئے۔ لودھراں کی مذکورہ کانفرنس میں میرے اِس اِعلان پر کہ مَیں اپنے اِنشائیہ کے ذریعے آپ کو ہنساؤں گا نہیں، اُردو کے ایک مقتدر اہلِ قلم چیخ اُٹھے تھے کہ مشکُور حسین یاد نے یہ کیا بات کر دی کہ وُہ اپنے اِنشائیے

کے ذریعے ہنسائیں گے نہیں۔شگفتگی تو انشائیہ کی جان ہے۔

مَیں آج آپ حضرات کی خدمت میں یہی بتانے کے لئے حاضر ہُوا ہُوں کہ شگفتگی یقیناً انشائیہ کے لئے بے حد ضروری ہے لیکن شگفتگی کا مفہوم خصُوصیت کے ساتھ انشائیہ میں وہ نہیں ہے جیسا کہ عام طور پر اِس لفظ سے سمجھا جاتا ہے۔ یہ دُرست ہے کہ شگفتگی کا تعلق ہنسنے ہنسانے سے بھی ہے۔ کیُونکہ آپ جب ہنستے ہیں تو کم از کم آپ کے ہونٹ ضرور حرکت کرتے ہیں یا دوسرے لفظوں میں یُوں کہہ لیجئے کہ یہ کبھی غنچہ بنتے ہیں تو کبھی گُل اور بعض اوقات تو ہنسنے میں آپ کا پُورا پیکر پھُول کی طرح کھِل اُٹھتا ہے۔ لیکن شگفتگی کا یہ مفہوم بڑی حد تک سطحی ہے۔ مضحک صورتِ حال سے دو چار ہو کر شگفتہ ہونا، شگفتگی کے بہت ہی معمُولی سے اظہار میں شمار کیا جاتا ہے۔ اپنی بات کو سمجھانے کے لئے اگر ہم فی الحال شگفتگی کے مفہوم کو ایک پھُول کی شگفتگی تک محدود رکھیں تو ایسی صُورت میں بھی ہمیں اِس لفظ کے بہت سے مفاہیم معلُوم ہو سکتے ہیں جس طرح ایک پھُول کھِلتا ہے شگفتہ ہوتا ہے اور اِس عمل میں اُس کا رنگ یا اُس کے رنگ اور خُوشبُو ہمارے سامنے آتے ہیں تو شگفتگی کا ایک فطری اظہار کہلاتا ہے۔ ایک اچھے اور معیاری انشائیے میں بھی ہر معنی ایک پھُول کی طرح ہوتا ہے اور جس وقت قاری پر یہ معنی اپنی وضاحت کے رنگ اور خُوشبُو کی چھُوٹ ڈالتا ہے تو سمجھ لیجئے، انشائیہ کی شگفتگی کی ایک ہلکی سی جھلک ہمارے سامنے آتی ہے۔ اب چُونکہ ہر عمدہ انشائیہ میں معانی کے ایک نہیں، بہت سے پھُول کھِلتے ہیں اِس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ انشائیہ میں شگفتگی کا مفہوم کیسے کیسے گُلشن کھِلانے کی استعداد رکھتا ہے۔

ابھی ہم انشائیہ کے ضمن میں پھُول کے استعارے کو بہت آگے تک لے جا سکتے ہیں۔ پھُول کھِلتا ہے تو اِس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ اُس کی شگفتگی کی داد دینے کے لئے آپ بھی اپنے دانت دِکھلانے شروع کر دیں بلکہ اگر آپ ایسا کریں گے تو عجب نہیں لوگوں کو آپ کی دماغی صحت پر شک گزُرنے لگے۔ البتہ پھُول کے کھِلنے پر آپ کو اُس کے رنگ و بُو سے

لُطف اندوز ہونے کا پُورا پُورا حق حاصل ہے۔ جس طرح آپ کسی پھُول کے کھِلنے پر خوش تو ہوتے ہیں لیکن ہنستے یا مُسکراتے نہیں۔ اسی طرح اِنشائیہ کی شگفتگی بھی آپ کو رنگا رنگ اور قسم قسم کی مسرتیں تو بخش سکتی ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ وُہ آپ کو ہنسنے پر بھی مجبُور کرے۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں، پھُول کی شگفتگی کا تمام تر مطلب یہ ہوتا ہے کہ وُہ آپ کے سامنے اپنی ذات کے کچُھ یا بہت کچُھ جلوے لا کر رکھ دے۔ اِس طرح اِنشائیہ نگار، اِنشائیہ میں شگفتگی کے ذریعے آپ کے سامنے کبھی اپنی ذات کے گوناگوں جلوے پیش کرتا ہے اور کبھی اپنی ذات کے حوالے سے غیر ذات کی رعنائیوں اور زیبائیوں کو بے نقاب کرتا ہے۔

جس طرح پھُول کی شگفتگی، پھُول کی تازگی کی ضامن ہوتی ہے، اِسی طرح اِنشائیہ کی شگفتگی بھی اِنشائیہ کے معانی کی تازگی اور ندرت کو ساتھ لے کر وارد ہوتی ہے۔ ایک اِنشائیہ کو کبھی باسی نہیں ہونا چاہیئے۔ وُہ ہمیشہ تازہ رہتا ہے اور یہیں سے پھُول کا استعارہ انشائیہ کے ضمن میں ہمارا ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ کیُونکہ ایک پھُول اگر تازہ ہے تو اگلے روز اُسے باسی بھی ہونا ہے۔ لیکن اِنشائیہ کی شگفتگی اِنشائیہ کو اس طرح کبھی باسی نہیں ہونے دیتی۔ یعنی اِنشائیہ کی شگفتگی یہاں آ کر پھُول کی شگفتگی سے مختلف ہو جاتی ہے۔ میرا مطلب ہے اِنشائیہ کی شگفتگی میں وسعت اور دوام ہے۔ یہ پھُول کی شگفتگی کی طرح پھُول تک محدُود نہیں ہوتی۔ اِس شگفتگی کا تعلق بعض اوقات تو پُورے عالمِ انسانیت سے اِس طرح ہوتا ہے جس طرح کسی صُبح کے اُجالوں کا تعلق اُس صُبح کے مکمل ظہُور سے ہوتا ہے۔

اگر ایک اِنشائیہ نگار اپنی افتادِ طبع کے مُطابق اپنے اِنشائیوں کے ذریعے قارئین کو گدگداتا ہے تو اس گُدگُدانے پر کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟ لیکن اگر آپ اِس گُدگُدانے کا یہ مطلب لیں کہ اِنشائیہ نگاری کا صرف یہی ایک طریقہ ہے تو یہ صنفِ اِنشائیہ کے ساتھ بہت بڑا ظلم ہے اور آج اِنشائیہ کے ساتھ یہی ظُلم ہو رہا ہے۔ اِس ہنسنے ہنسانے کی صفت یعنی طنز و مزاح کو آسان کام سمجھنے کے باعث یعنی شگفتگی کے مفہوم کو غلط سمجھنے کے باعث سب سے بڑا ظلم صنفِ اِنشائیہ

کے ساتھ یہ ہو رہا ہے کہ ہر لکھنے والا اور کچھ لکھ سکنے کی قدرت رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو لیکن وُہ انشائیہ لکھنا ضرور شروع کر دیتا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب ہمارے بُزرگ کہا کرتے تھے کہ ایک انشائیہ نگار صحیح معنی میں چالیس سال کی عُمر گزرنے کے بعد انشائیہ نگار بنتا ہے۔ اِن بزرگوں کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ انشائیہ نگاری کوئی مُنہ کا نوالہ نہیں کہ جب چاہا اُسے نگل لیا۔ اِس کے لِئے بڑے تجربے، عقل اور محنت و ریاضت کی ضرورت ہے۔ گویا انشائیہ میں شگفتگی کے جوہر دکھلانے کے لئے خُون پسینہ ایک کرنا پڑتا ہے۔ اِنشائیہ میں شگفتگی کے مفہوم کو مزید واضح کرنے کے لِئے میں اپنی کتاب "ممکناتِ انشائیہ" کے صفحہ نمبر ۸۳ سے ایک اقتباس پیش کر کے اپنے مضمون کو ختم کرتا ہُوں۔

"کسی فکر انگیز تحریر کو پڑھ کر ہمیں جس نوع کی تفریح حاصل ہوتی ہے، وہ ہمارے لبوں کے دریچے تو یقیناً وا نہیں کرتی لیکن ہمارے قلب و نظر کے دریچے ضرور وا کر دیتی ہے۔ اور آپ جانتے ہیں جو ادب پارہ ہمارے قلب و نظر کے دریچے وا کرتا ہے۔ وہ عُمر بھر ہمارے کام آتا ہے۔ قلب و نظر کے دریچے وا ہوتے ہیں تو زندگی کا سفر ہمارے لِئے آسان ہو جاتا ہے۔ راہِ حیات میں ہمارے قدم زیادہ مضبُوطی اور اِعتماد کے ساتھ اُٹھتے ہیں اور یُوں زندگی کے دشوار اور کڑے کوس ہمارے لِئے تکان کا باعث نہیں بنتے۔ بلکہ اس کے برعکس وہ ہمارے لِئے ایک ایسا چیلنج ثابت ہوتے ہیں جو ہماری ایک ایک سانس کو ہمارے لِئے خوشگوار بنا دیتا ہے۔ اِس طرح دیکھا جائے تو ادب میں تفریح (یا شگفتگی) کے معنی عقدہ کُشائی سے ہم آہنگ نظر آتے ہیں ـــــ گویا تفریحِ ادب مُشکلِ حیات کی گرہیں کھولتی ہے۔ ہمارے لئے ادب کا مطالعہ بھی اِسی لِئے لازم ہو جاتا ہے کہ جس طرح اِنسانوں کے مسائل کی عقدہ کُشائی ادب کے ہاتھوں عمل میں آتی ہے۔ اِس کی مثال ہمیں اور کہیں نہیں ملتی۔ اِنشائیہ چُونکہ بنیادی طور پر ایک ادب پارہ ہے۔ اِس لِئے اس کا تفریحی پہلُو اپنے دامن میں لُطف اندوزی کے وہی عناصر رکھتا ہے جن کا ذکر ابھی کیا گیا ہے۔ بلکہ سچ پُوچھئے تو اِنشائیہ میں تفریحِ ادب کی

ہر صُورت اپنے کمال پر نظر آسکتی ہے۔ اِس میں ہنسنے اور ہنسانے والی تفریح یعنی طنز و مزاح کی بھی عُمدہ سے عمدہ مثال پیش کی جاسکتی ہے اور غور و فکر کے اعلیٰ سے اعلیٰ نمُونے بھی سامنے لائے جاسکتے ہیں۔ ممکن ہے ظاہر میں یہ بات معمولی سی نظر آئے لیکن غور کیجیے تو معلوم ہو کہ ایک ادیب کو مُنہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے جس قدر مواقع اِنشائیہ میں میّسر آسکتے ہیں۔ کسی دُوسری صِنف میں ممکن نہیں ـــــ ہر صِنفِ ادب اپنے کئی رُخ تو رکھتی ہے لیکن اتنی وُسعت نہیں رکھتی اِس ضمن میں اِنشائیہ کا دامن ہمیشہ وسیع رہا ہے۔"

باقی رہا اِس سیمینار میں اُٹھائے گئے اِس سوال کا جواب کہ انشائیہ کیا ہے؟ تو اِس کا جواب مختصر ترین الفاظ میں یہ دیا جاسکتا ہے کہ اِنشائیہ سب کُچھ ہو سکتا ہے لیکن کوئی غیر سنجیدہ صنفِ ادب قطعی نہیں۔ میں تو اِنشائیہ کی وسعت کا یہاں تک قائل ہُوں کہ آج سے کئی برس پہلے میں نے محمّد حسن عسکری کی کتاب ستارہ یا بادبان میں شامل کئی مضامین کو بقول احسن فاروقی مرحُوم تنقیدی اِنشائیے کہا تھا۔ جس پر میرے کچُھ کرم فرما ابھی تک پریشان ہیں اور وُہ میری یہ سیدھی سادھی سے بات ابھی تک نہیں سمجھ پائے ہیں۔

بہر حال اِنشائیہ اپنی شگفتگی کے وسیع تر مفہُوم کے باعث ادب کی ایک وسیع ترین صنفِ ادب ہے۔ اِنشائیہ کے ضمن میں اہل ادب کا آج سب سے بڑا اور اہم فرض یہ ہے کہ وُہ اِنشائیہ کی وُسعت کو پہچانیں اور اُس کی شناخت کو اپنی حسِ معنی کا ایک حصّہ بنائیں۔

اِنشائیہ کے مباحث

ڈاکٹر انور سدید

سب سے پہلے مجھے رانا عبدالمجید صاحب کا شکریہ ادا کرنا ہے کہ اُنہوں نے انشائیہ کانفرنس کا اہتمام "لودھراں" جیسے مقام پر کیا جو تہذیب کے بڑے بڑے مراکز سے دُور ایک دیہاتی وضع کا اِنشائیہ نما شہر ہے۔ مجھے اِس شہر کی ساخت غیر رسمی، بے ترتیب، ڈھیلی ڈھالی اور سیّال سی نظر آتی ہے۔ آپ کوٹ پتلون پہن کر سڑک پر آجائیں تو لوگ آپ کے لئے اجنبی ہو جاتے ہیں، قومی لباس شلوار قمیص پہن لیں تو مغائرت پیدا نہیں ہوتی لیکن تہمد اور کھلے آستینوں کا کرتہ پہن لیں تو اس شہر کے لوگ آپ کو اپنا دوست بنا لیتے ہیں اور فصلوں اور زمینوں کے رشتوں اور ناتوں کے، کچہریوں اور مقدموں کے سارے راز ایک انشائیہ نگار کی طرح آپ کے سامنے عُریاں کر ڈالتے ہیں۔ اس شہر میں آپ کو اپنے چہرے پر تہذیب کا ملمّع شدہ مکھڑا لگانے کی ضرورت نہیں، یہ شہر تو مٹّی کی مہکار کو پہچانتا ہے اور آپ کو اِس مہکار سے لطف اُٹھانے کی دعوت دیتا ہے۔

اِس کانفرنس کے اہتمام میں شہزاد قیصر صاحب کا سلیقہ اور رافسر ساجد صاحب کا دقیقہ شامل نہ ہوتا تو شاید ہم سب کو کھل کر قہقہہ لگانے کا موقعہ تو مل جاتا لیکن نقصان یہ ہوتا کہ

معمولی اشیا کو غیر معمولی اور شگفتہ انداز میں پیش کرنے اور دیکھے ہوئے مظاہر کو نئے اور انوکھے زاویوں سے مشاہدہ کرنے کا موقعہ شاید ضائع ہو جاتا۔ سیّد سرفراز حسین اس محفل کے مہمان خصوصی ہیں تہذیبی اعتبار سے یہ بھی منتظمین کے انشائی عمل ہی کا حصّہ ہے۔ سیّد صاحب نے مرتضیٰ برلاس صاحب پر ایک کتاب کی تقریب میں جو تقریر ملتان میں کی تھی میں نے اس کے اقتباسات لاہور میں پڑھے تھے اور حیران ہوا تھا کہ اس محفل میں موجود ادبا نے انہیں انشائیہ نگار کیوں تسلیم نہیں کیا۔ حالانکہ انہوں نے اس تقریر میں صداقت کو ہی گلے لگایا تھا اور حقیقتِ عمل کے فروغ ہی کی تحریک کی تھی اور یہ وہی عمل ہے جس کی ترویج و تشویق میں ماہنامہ پیش پیش رہا ہے۔ سیّد صاحب کو ایک ایسے پرشوق منتظم یعنی ARDEUT ADMINISTRATOR کی حیثیت حاصل ہے جو مثبت اور منفی قوتوں کے درمیان نہ صرف توازن و اعتدال قائم رکھتے ہیں بلکہ بعض اوقات انہیں اس طرح جوڑ بھی دیتے ہیں کہ ان سے روشنی پیدا ہو جاتی اور منفی قوت کے اعماق سے بھی لو پھوٹ نکلتی ہے۔ اس محفل میں غلام جیلانی اصغر اور مشکور حسین یاد۔ ڈاکٹر سلیم اختر اور انور سدید، فرحت نواز اور پرنسپل طاہر تونسوی نظر آ رہے ہیں تو اسے حادثہ شمار نہ کیجئے بلکہ اسے سیّد صاحب کی عطا سمجھئے کہ انہوں نے لودھراں میں سفید پھریرا عین اس وقت لہرایا جب انشائیے کی کلغی چونچوں سے سرخ نظر آنے لگی تھی۔

آج سے چند سال قبل اسی قسم کی ایک خوبصورت، دل کش اور خیال نواز محفل کا اہتمام بہاول پور میں ڈاکٹر فرحت عبّاس نے کیا تھا اس کی صدارت کے لئے بہاول پور کے منتظم اعلیٰ چوہدری محمد شریف صاحب کو زحمت دی گئی تھی، تقریب سے پہلے ان سے غیر رسمی ملاقات ہوئی تو انہوں نے خیال ظاہر کیا کہ "ادبی محفل بھاری بھرکم ہوتی ہے۔ مقالات لوگوں کے سروں سے گزر جاتے ہیں اور اس قسم کی محفل کو زیادہ دیر تک برداشت کرنا ممکن نہیں ہوتا۔" لیکن واقعہ یہ ہے کہ جب چند غیر اہم موضوعات پر انشائیے پیش کئے گئے اور اشیا اور مظاہر کو پرانے مدار سے نکال کر حقیقت کے ایک نئے اور روشن مدار میں لانے کی سعی کی گئی تو معمولی سی بات کے غیر معمولی زاویے سامنے آنے لگے اور بات سروں پر سے گزرنے کے بجائے دلوں میں اترنے لگی۔ پھر

اس شام کی محفل میں نہ صرف صاحبِ صدر کی دلچسپی بڑھتی چلی گئی بلکہ سامعین نے بھی انشائیہ نگاروں کی نکتہ آفرینیوں کی داد دل کھول کر دی اور آخر میں صدرِ جلسہ نے تجویز کیا کہ انشائیہ خوانی کی مزید محفلیں منعقد ہونی چاہئیں تاکہ لوگوں کا ذہنی تشنّج دُور ہو اور انہیں زندگی کی ہموار سطح سے اشیاء اور مظاہر کو دیکھنے کا موقعہ ملے۔ اعتدالِ فکر و نظر پیدا ہو اور ذہنی کتھارسس عمل میں جائے۔

گذشتہ کئی سالوں سے ہمارے ہاں فریقِ مخالف کو کردار شکن پھبتی یا کٹیلے حملے سے شکست دینے کا جو رجحان ترویج پا رہا ہے بد قسمتی سے اسے طنز و مزاح کا عنوان دے دیا گیا ہے۔ درآں حالیکہ حقیقت یہ ہے کہ مزاح تمسخّر کی زد میں آئے ہوئے فرد اور اکثر اوقات مزاح نگار کی اپنی ہئیت کذائی یا بوالعجبی پر اجتماعی قہقہہ بیدار کرتا ہے۔ طنز نگار اپنے آپ کو برتر مخلوق سمجھتے ہوئے فریقِ مخالف کو خندۂ استہزا سے زیر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ دونوں عمل قومی صحت کے لِئے بظاہر مفید قرار دیئے جاتے ہیں اور فاضل قوّت کے اخراج میں معاون ثابت ہو سکتے ہیں لیکن طنز و مزاح کو برداشت کرنے کے لِئے ظرف بلند نہ ہو تو مغائرت کی دیوار اُونچی ہوتی چلی جاتی ہے اور دلوں کا فاصلہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔ انشائیہ دوستانہ سطح پر محبّت کی فضا پیدا کرتا اور باہمی یگانگت کو فروغ دیتا ہے۔ موضُوع اور مظہر کی شگفتگی کو بیدار کرنے کے لِئے انشائیہ طنز اور مزاح کے حربوں سے بھی استفادہ کرتا ہے لیکن اس صنف کا مقصد خندۂ دنداں نما پیدا کرنا یا تضحیک کرنا ہرگز نہیں۔ انشائیہ نہ تو طنز کی جراحت پیدا کرتا ہے اور نہ مزاح کی ظرافت۔ انشائیہ میں طنز و مزاح کی آمیزش بس اتنی ہی ضروری ہے جتنی آٹے میں نمک۔ لیکن نمک کی مقدار بڑھ جائے تو لُقمہ گلے سے اُتارنا مُشکل ہو جاتا ہے۔ چُنانچہ جب یہ دونوں یا ان میں سے کوئی ایک غیر معمولی انداز میں انشائیہ پر حملہ زن ہو جائے تو انشائیہ عدم توازن کا شکار ہو جاتا ہے۔ انشائیہ تو ایک غیر رسمی، بے ترتیب، ڈھیلی ڈھالی اور سیّال صنفِ ادب ہے جو موضُوع کی مناسبت سے اپنی ہیئت اور رنگ تبدیل کر لیتی ہے اور نیرنگِ نظر پیدا کرتی چلی جاتی ہے۔ طنز اور مزاح تخلیق کار کے اسلُوب کا حصّہ ہے اور انہیں افسانہ، ناول، نظم، غزل حتّٰی کہ تنقید تک میں آسانی سے آزمایا جا سکتا ہے۔ یہ

الگ بات ہے کہ تنقید میں مزاح اور طنز در آئے تو زیرِ بحث صنفِ ادب کی بنیاد متزلزل نہیں ہوتی بلکہ خود مصنف بے معنی ہو جاتا ہے۔

دُوسری طرف اِنشائیہ اُسلُوب کا حصّہ نہیں، یہ ایک الگ صنفِ اظہار ہے۔ اِنشار اس کے متعدّد اوصاف میں سے ایک داخلی وصف ہے لیکن اِس صنف کو انشار سے اشتقاق نہیں کیا گیا۔ انگریزی میں اِس صنف کے لیئے ESSAY کا لفظ مستعمل ہے جو "اسّعی" سے ماخوذ قرار دیا جاتا ہے۔ اور اِس کا مفہوم ہے "کوشش کرنا"۔۔۔ اُردو میں جو انشائیہ اب فروغ پا رہا ہے وہ انگریزی ESSAY کا چھوٹا بھائی نہیں بلکہ انگریزی ایسے کی ایک شاخ PERSONAL ESSAY کے زیادہ قریب ہے اور مرورِ ایّام کے ساتھ انشائیہ نے اپنا جُداگانہ مزاج متعیّن کر لیا ہے۔ اپنی حدودِ فن تراش لی ہیں۔ چُنانچہ دلچسپ بات یہ ہے کہ اِنشائیہ زندگی اور کائنات کے ہر موضُوع کو مس کرتا ہے لیکن جب اِنشائیہ نگار موضُوع کو نئے مدار میں لے آتا ہے تو وُہ دُوسرے موضوعات کو بھی لپیٹ میں لینے سے گریز نہیں کرتا۔ اِنشائیہ نگار اظہار کی ڈور کو ڈھیل دیتا ہے اور پتنگ کو ہر سمت میں اڑانے کے باوجُود موضُوع کی ڈور اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے۔ طنز و مزاح ایک خاص سمت میں سفر کرتے ہیں اور تخلیق نگار کو ایک مخصُوص ڈگر سے ہٹنے کی اجازت نہیں دیتے۔ ہمارے مُلک میں اچھا مزاح پیدا کرنے کے زیادہ مواقع موجُود نہیں، مزاح کو عالی ظرفی سے قبُول کرنے کا رجحان بھی خاصا کمیاب ہے۔ طنز چُونکہ مخالف کو زیر کرنے کا مؤثر حربہ ہے اِس لیئے اس کا چلن ہمارے ہاں نسبتاً زیادہ ہے۔ لیکن طنز کا بے محابا استعمال اِنشائیہ کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتا۔ چنانچہ فی الوقت جو مسئلہ اہمیت حاصِل کر رہا ہے وہ خالص طنز یا خالص مزاح کے مضامین کو اِنشائیہ قرار دینے کا مسئلہ ہے اور قبولیت کی مہر لگوانے کے لیے چُونکہ عمُوماً ڈاکٹر وزیر آغا کی طرف دیکھا جاتا ہے اِس لیئے انشائیہ کا مزاج اور اس کا فن بھی زیرِ بحث آ جاتے ہیں۔ اور اکثر ایسی آرار کا اظہار بھی ہوتا ہے جو دلیل اور مطالعے کی روشنی سے محروم نہیں ہوتیں بلکہ اُن میں ذاتی رنجش کی بُو بھی موجُود ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی صاحب محمد حسن عسکری کی تنقیدی نگارشات کو

اِنشائیے قرار دیں تو آپ اُن کے بارے میں کیا رائے دیں گے؟ اور میں اگر ڈاکٹر سلیم اختر کو انشائیہ نگار تسلیم کر لوں کیوں کہ اُنہوں نے اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ لکھی ہے تو آپ اس ناچیز انور سدید کے بارے میں کیا کہیں گے؟ میرے نزدیک اس نزاعی مسئلے کا صِرف ایک ہی حل ہے اور وہ یہ کہ آئندہ اِنشائیوں پر وزیر آغا سے مُہر نہ لگوائی جائے۔ اور انشائیہ پر مہر لگانے کا کام آج کی یہ کانفرنس کسی اور ادبی شخصیت کو تفویض کر دے۔ حضرات! یہ کام جتنی جلدی ہو گا انشائیہ نگاروں کے لیے اتنا ہی مفید ہو گا۔

اِنشائیہ نے جن مباحث کو جنم دیا ہے ان میں سے ایک اہم مسئلہ یہ بھی ہے کہ "انشائیہ کا بانی کون ہے"؟ —— ایک طبقے کا خیال ہے کہ اِس کا بیج سر سید احمد خاں اِنگلستان سے لائے تھے اور اس کی اوّلین پنیری "تہذیب الاخلاق" میں لگائی گئی تھی۔ اس خیال کو فروغ دینے میں وزیر آغا پیش پیش ہیں۔ لیکن اب ڈاکٹر جاوید وششٹ نے دعویٰ کیا ہے کہ اِنشائیہ بَرصغیر میں اُردو زبان کی صنفِ ادب ہے اور اس کے اوّلین نقوش ملّا وجہی کی "سب رس" میں دستیاب ہیں۔ اس کے برعکس بعض لوگ جن میں انور سدید بھی شامل ہے وزیر آغا کو اُردو اِنشائیے کا بانی قرار دیتے ہیں۔ یہ لوگ ہمیں سمجھاتے ہیں کہ سر سید احمد خاں نے جس نوع کے اصلاحی مضامین لکھے تھے اُن میں انشائیے کا مزاج جزوی طور پر موجود ہے۔ لیکن یہ خصوصیات تو بعض ناقدین نے میر امن دہلوی کی "باغ و بہار" اور میرزا غالبؔ کے خطوط میں بھی تلاش کر لی ہیں۔ بینسنؔ نے مانتینؔ کو اِنشائیے کا اوّلین تخلیق کار تسلیم کیا تھا لیکن اُنہوں نے اس کے ابتدائی نقوش سائی سیرو اور افلاطون کی تحریروں میں بھی دریافت کئے ہیں۔ اور ڈبلیو آر جیبسن کا خیال ہے کہ اِنشائیہ کا مزاج ایران اور چین کی قدیم تحریروں میں بھی موجود ہے۔ گویا آپ ماضیِ بعید میں جتنا بھی سفر کریں آپ کو انشائیے کے نقوش مِلتے چلے جائیں گے اور وہ نقطہ تلاش کرنا شاید ممکن نہ ہو جہاں پہلے اِنشائیہ نے جنم لیا تھا۔ لیکن فی الوقت مسئلہ انشائیے کے جنم کا نہیں، اِنشائیے کے بانی کا ہے۔ جس طرح کسی خاندان کے بانی کے لِئے ضروری ہے کہ وہ صاحبِ نسل بھی ہو اسی طرح کسی صنفِ ادب کے لئے بھی لازم ہے کہ اس کی توسیع

اِس کے لکھنے والے کریں۔ آپ بابر کو خاندانِ مغلیہ کا بانی قرار دیتے ہیں تو اس کا باعث یہ ہے کہ بابر سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک مغل فرمانرواؤں کا ایک طویل سلسلہ موجود ہے۔ تاریخ ادب کا یہ واقعہ بڑا المناک ہے کہ سرسید نے ایڈیسن اور سٹیل کی تقلید میں جس نوع کے انشائیے کی بنیاد ڈالی اس کا سلسلہ سرسید سے آگے نہیں چلا۔ حالاں کہ اُن کے حلقۂ ادب میں حالیؔ، نذیر احمد اور شبلی جیسے نثر نگار اور تہذیب کے پیغمبر موجود تھے۔ چنانچہ سرسید کا انشائیہ ابھی تک لاولد ہے۔ کسی ادیب کو کسی صنف کا بیک وقت مبتدی یا منتہی کہنا اس کی توصیف یا تحسین نہیں بلکہ بالواسطہ طور پر ان کی تنقیص ہے کہ وہ اپنے سلسلۂ فن کو آگے نہیں بڑھا سکے۔

مَیں ڈاکٹر وزیر آغا کو اُردو انشائیہ کا بانی قرار دیتا ہوں تو اُس کی ایک بنیادی وجہ یہ ہے کہ اُنہوں نے اس صنف کی بنیادی بوطیقا وضع کی ہے۔ اور اِس بوطیقا کے مطابق انشائیے تخلیق کیے ہیں، دُوسری بات یہ کہ اُنہوں نے "پرسنل ایسے" کے جس اُسلوب کی ترویج و اشاعت کی اس اُسلوب میں انشائیہ لکھنے والوں کی ایک جماعت بھی پیدا کی۔ ۱۹۵۰ء کے لگ بھگ وزیر آغا اس اُسلوب کے تنہا انشائیہ نگار تھے۔ پھر اس انداز کو مشتاق قمر اور جمیل آذر نے قبول کیا اور اب اِس مخصوص اُسلوب میں انشائیہ لکھنے والوں کی ایک کہکشاں مرتب ہو چکی ہے اور اس میں روز بروز نئے ستاروں کا اضافہ ہو رہا ہے۔ آج کے نقّاد کو پُورا حق حاصل ہے کہ وہ اِس قسم کے انشائیے کا سیاپا کرے اور چاہے تو اس کی بنیاد تک ہلا دے اور جس تحریر کو چاہے اس پر انشائیے کا لیبل چسپاں کر دے اِس سے ملک کے امن کو اور لکھنے والوں کی صحت کو کوئی خطرہ لاحق نہیں۔ لیکن یہ شاید مناسب نہیں کہ وہ نئے لکھنے والوں کو وزیر آغا کے اُسلوب میں انشائیہ لکھنے کی اجازت ہی نہ دے بلکہ انشائیہ کا سیاپا شروع کر دے۔ انشائیہ کا ایک اور موضوع جس نے خاصہ خلطِ مبحث پیدا کیا ہے وُہ انشائیہ کے نام کے بارے میں ہے۔ بعض ناقدین کا خیال ہے کہ لفظ "انشائیہ" اختر اورنیوی کی اختراع ہے اور اُنہوں نے علی اکبر قاصد کے مضامین کو اوّلین انشائیے قرار دیا تھا۔ اس خیال کی تردید نہیں کی گئی۔ لیکن یہ وضاحت ضروری ہے کہ "انشائیہ" متروک اللغت لفظ نہیں ہے۔ اور اسے مولانا محمد حسین آزادؔ نے

اِنشائی معنوں میں متعدّد مرتبہ اِستعمال کیا گیا ہے۔ اختر اورینوی نے اِس لفظ کا سکّہ نئے معانی میں جاری کیا تھا لیکن یہ سکّہ ٹکسال سے باہر نہیں نکل سکا اور علی اکبر قاصد کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کے ساتھ ہی غائب ہو گیا۔ آپ کو شاید یہ سُن کر حیرت ہو کہ اِس اصطلاح کو عوامی قبولیت مرزا ادیب نے دی جنہوں نے "ادبِ لطیف" میں ڈاکٹر وزیر آغا کے متعدد اِنشائیے شائع کئے اور یُوں صِرف اِنشائیہ کا لفظ لوگوں کے دِلوں میں اُتار دیا بلکہ یہ باور کرانے کی کوشِش بھی کی کہ اِس صِنف کا آغاز "ادبِ لطیف" نے کیا اور اِس کے اوّلین باقاعدہ اِنشائیہ نگار ڈاکٹر وزیر آغا ہیں۔ یہاں اِس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ وزیر آغا نے اپنے آپ کو اِس صنف کا بانی کبھی شمار نہیں کیا۔ اِس موضُوع پر ان کا اوّلین تنقیدی مقالہ "خیال پارے" میں شامِل ہے اور یہ اِس حقیقت کا شاہِد ہے کہ اُنہوں نے اِس صِنف کی جڑیں تلاش کرنے کے لِئے ماضیِ بعید میں سر سیّد احمد خاں تک سفر طے کیا ہے۔ اِنشائیہ کا فروغ ان کی ادبی زندگی کا ایک اہم ترین مشن نظر آتا ہے اور اس مشن کی تکمیل میں وُہ بڑی سرگرمی سے کوشاں ہیں۔ اور یہ اُن کی سعی و جُہد ہی کا نتیجہ ہے کہ اِنشائیہ اُردو کی واحد صنفِ ادب ہے جس میں پاکستان نے ہندوستان پر اور دُنیا کے ان تمام ممالک پر جہاں اُردو بولی جاتی ہے فوقیت اور فضیلت حاصِل کی ہے۔

اِنشائیہ کی خُوش قسمتی یہ بھی ہے کہ اسے مخالفین کا معتد بہ حلقہ نصیب ہے ہر چند معترضین کا رویّہ غیر سنجیدہ اور غیر علمی ہے لیکن میں اس قسم کے اختلاف کو انشائیہ کے لِئے غیر مفید تصور نہیں کرتا۔ اِنشائیہ کے فروغ میں جو خدمات جناب احمد ندیم قاسمی، جناب ڈاکٹر سلیم اختر، جناب پروفیسر مشکُور حسین یاد اور جناب پرنسپل ڈاکٹر طاہر تونسوی صاحب نے سرانجام دی ہیں وہ وزیر آغا، غلام جیلانی اصغر اور جمیل آذر کی خِدمات سے کسی طرح کم نہیں۔ اِنشائیے کے قصّے کو ان محترم ادیبانے اپنے لہُو سے رنگین بنایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اِنشائیہ کا کردار متنازعہ ضرور ہے لیکن مشکوک ہرگز نہیں۔ ایک الگ صنفِ ادب کے طور پر اِس کے پاؤں اَب جم چکے ہیں۔ اس کا ذکر لاہور، کراچی، اسلام آباد، مُلتان اور پشاور جیسے بڑے شہروں ہی میں نہیں ہوتا بلکہ لودھراں جیسے مقام پر بھی اور سرگودھا، گوجرانوالہ، بہاولپور جیسے

شہروں میں بھی اس صنف کی خصوصی محفلیں منعقد ہوتی ہیں۔ میری آرزو ہے کہ اختلافِ فکر و نظر کا یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہے۔ اس بحث نے ہی اُردو اِنشایئے کو مقبولیت کی راہ پر گامزن کیا ہے۔ غالبؔ کو بجنوری نے ہی متعارف نہیں کرایا غالب کی عظمت کا راز ڈاکٹر لطیفؔ کے انکارِ غالب میں بھی موجود ہے اور غالبؔ کی وجہ ہی سے ڈاکٹر لطیفؔ بھی زندہ ہیں۔

اِنشائیہ فیشن نہیں لیکن بعض لوگ اِسے فیشن کے طور پر قبول کرنے پر آمادہ ضرور ہیں۔ خُوشی کی بات یہ ہے کہ اُردو میں پرسنل ایسے کے مترادف کے طور پہ وافر مقدار میں اِنشائیے تخلیق ہونا شرُوع ہو گئے ہیں، لوگوں کو اِنشائیہ کے مزاج سے قربِ آشنائی نصیب ہو رہا ہے اور اب اِنشائیہ پڑھتے یا سُنتے ہی پہچان لیا جاتا ہے کہ کون سا ادب پارہ اِنشائیہ اور کون سا طنز و مزاح کا عُمدہ نمُونہ — اور قارئین کو اپنا فیصلہ صادر کرنے میں دیر نہیں لگتی۔ اور یہ فیصلہ ایسا ہوتا ہے جس کے لِیے کِسی میلے کا اہتمام بھی نہیں کرنا پڑتا۔

ڈاکٹر وزیر آغا ___ بحیثیت انشائیہ نگار

(خصوصی حوالہ "چوری سے یاری" تک)

___ ڈاکٹر انور سدید

ڈاکٹر وزیر آغا شاید اُردو زبان وادب کے واحد ادیب ہیں جن کا نام نثر کی ایک صنفِ اظہار "اِنشائیہ" کے ساتھ کچھ اس تختگی سے وابستہ ہو گیا ہے کہ اب اس صنف کا تصوّر وزیر آغا کے بغیر مکمل نہیں سمجھا جاتا اور کچھ لوگ اس صنف کے ساتھ منفی ہونے کی کوشش کر رہے ہیں تو اُن کا رویّہ اسی طرح کا ہے جیسے ڈاکٹر لطیف نے مرزا غالب کے بارے میں اختیار کیا تھا۔ یعنی وہ خود غالب تو کیا ہر کی سطح کا شعر کہنے کی قدرت نہیں رکھتے لیکن بیڑہ تنقیصِ غالب کا اُٹھا لیتے ہیں۔ میں اس قسم کے نقادوں کی دُنیا دارانہ دانشمندی کا معترف ہوں کہ آج جب اِنشائیہ کے مثبت زاویوں کے ذکر میں وزیر آغا کی خدمات کا اعتراف کیا جاتا ہے تو ان لوگوں کا ذکر بھی ہو جاتا ہے جنہوں نے اس کی مخالفتِ بے جا کا عہد کر رکھا ہے اور اس عمل و تنقیدی دیانت کو بھی قربان کر ڈالنے سے گریز نہیں کرتے لیکن خود کبھی اِنشائیہ نہیں لکھا اور نہ اس کی پہچان رکھتے ہیں۔ وزیر آغا کی منفرد عطایہ ہے کہ اُنہوں نے اس صنف کو وسیع پیمانے پر متعارف کرانے، اس کا دائرۂ تخلیق بڑھانے، تخصیصی نقوش اُجاگر کرنے اور اس کی فنی بوطیقا کی ترتیب و تدوین میں سب سے زیادہ دلچسپی لی، اُنہوں نے نہ صرف اِس صنف کی نمائندہ تخلیقات پیش کیں بلکہ اُردو اِنشائیہ کے سب سے

ہوشمند نقّاد کا فریضہ بھی ادا کیا۔ چنانچہ اب تک اِنشائیہ کے باب میں جتنے مباحث اُٹھے ہیں ان سب کے پسِ پُشت وزیر آغا کے نظریات کے اثبات یا ان سے اختلاف کا زاویہ موجود نظر آتا ہے اور اس صنفِ ادب میں جتنی بھی رَوشنی نظر آتی ہے وہ سب وزیر آغا کے ریاض اور وظیفۂ فن سے پیدا ہُوئی اور اس کا مدار مرورِ ایّام کے ساتھ وسیع ہوتا جارہا ہے۔ تاریخِ ادب میں یہ واقعہ بھی محفوظ کرنے کی ضرورت ہے کہ اس صنفِ اِنشائیہ کے بارے میں ایک ماہ کے قلیل سے عرصے میں ایک عظیم الشّان کانفرنس لودھراں میں منعقد ہُوئی، ایک علمی مذاکرہ ٹیلیویژن سے نشر ہُوا اور اب ایک سیمینار بہاول پُور کی اسلامیہ یُونیورسٹی میں منعقد ہو رہا ہے اوّل الذکر دو مجالس میں سے اِنشائیہ کے باب میں جو نام سب سے زیادہ اُبھر کر سامنے آیا ہے وہ ڈاکٹر وزیر آغا ہی کا تھا۔ اُن کے کام پر فی الوقت پی ایچ ڈی کے چار مقالے ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں لکھے جارہے ہیں، اُن کی انشائیہ نگاری پر اسلامیہ یُونیورسٹی بہاولپُور میں ان کے فن کے دوسری جہات پر زکریا یونیورسٹی اور پنجاب یُونیورسٹی میں کام ہو رہا ہے۔ مقصد وزیر آغا کی عظمت کا اظہار نہیں بلکہ یہ کہ اِنشائیہ کے ساتھ وزیر آغا کی وابستگی بے ریا اور بے لوث قسم کی ہے۔ اس کے فروغ و ارتقاء میں اُنہوں نے سرگرمی اور مستقل مزاجی سے حصّہ لیا ہے۔ اِس صنف کی بوطیقا کے مزاج کو جامد بنانے کے بجائے اُنہوں نے اسے وسیع کرنے کی کوشش کی چنانچہ یہ اُنہیں کی محنت کا ثمر ہے کہ اب دُنیا میں اِنشائیہ کو خالصتاً پاکستانی صنفِ ادب کے طور پر متعارف کرانے کا فخر ہمیں حاصل ہے اور اب پُوری کائنات میں جہاں اُردو بولی، پڑھی اور لکھی جاتی ہے وہاں اسے پاکستانی صنفِ ادب میں شمار کیا جاتا ہے اور پھر اس میں نئے نئے نقوش اُبھارنے کی کوشش کی جاتی ہے

یہ رُتبۂ بلند مِلا جس کو مل گیا ہر مدّعی کے واسطے دار و رسن کہاں

اِنشائیہ نگار کی حیثیت میں وزیر آغا کا طلُوع ۱۹۵۶ء کے لگ بھگ ہُوا۔ اس وقت اُردو ادب میں اِنشائیہ کے نقوش بِکھرے بِکھرے سے تھے۔ فنّی بوطیقا منتشر حالت میں تھی، مولیئر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جب اُسے بتایا گیا کہ وہ تمام عُمر نثر بولتا رہا ہے تو وہ حیران ہو گیا تھا۔ کچھ یہی کیفیت

اُردو اِنشائیہ نگاروں کی تھی۔ وُہ ڈاکٹر جانسن کی وضع کردہ تعریف کے مدار میں لاشعوری طور پر یقیناً داخل ہو جاتے تھے اور اپنے ذہن کی آزاد ترنگ سے غیر منظم، بے ترتیب اور غیر ہضم شدہ نثر کا ٹکڑا پیش کر دیتے تھے لیکن انہیں یہ علم نہیں ہوتا تھا کہ وہ "انشائیہ" لکھ رہے ہیں۔ مَیں نے اُردو کے ممتاز افسانہ نگار ممتاز مفتی کو جب بتایا کہ ان کی کتاب "غبارے" کے مضامین میں سے "پہاڑ"۔ "باپ" اور "بڑھاپا" مکمل انشائیے ہیں اور وہ اُردو اِنشائیہ کے پیش رووں میں سے ہیں تو اُنہوں نے اُردو اِنشائیہ کا مبتدی یا منتہی بننے کا اعزاز قبول کرنے کے بجائے کمال سادگی سے فرمایا۔

"انور سدید۔ اس وقت مجھے پتہ نہیں تھا کہ مَیں اِنشائیہ لکھ رہا ہوں۔ یہ بات تو تم نے اَب آکر کھولی ہے"۔

میرا خیال ہے کہ انشائیہ کی طرف وزیر آغا کی پیش قدمی بھی لاشعوری قسم کی تھی۔ یعنی ابتدا میں شاید انہیں بھی معلوم نہیں تھا کہ وُہ اِنشائیہ لکھ رہے ہیں یا اُردو ادب کو ایک نئی صنفِ نثر سے متعارف کرا رہے ہیں۔ ان کا اس قسم کا پہلا نثر پارہ "ادبی دنیا" میں اپریل ۱۹۴۹ء میں "بہار کی ایک شام" کے عنوان سے شائع ہُوا تو یہ نا موسوم تھا اور مولانا صلاح الدّین احمد نے اس کا تعارف کراتے ہُوئے فرمایا تھا کہ۔

"بہار کی ایک شام" یوں تو موسم کی ایک چیز ہے لیکن اپنی خیال انگیز داخلی کیفیّت کے اعتبار سے ایک مستقل ادبی اور نفسیاتی حیثیّت رکھتی ہے"۔

اس دَور میں ڈاکٹر داؤد رہبر نے "ٹیلے کی روشنی" اور "لمحے" کے عنوان سے، جاوید صدیقی نے "بے ترتیبی"۔ غُلام علی چودھری نے "ہرجائی" حسنین کاظمی نے "پتنگیں آسمانوں میں" اور امجد حسین نے "مسکینی" کے نام سے جو مضامین مختلف ادبی رسائل میں لکھے ان سب میں اِنشائیہ کے فنی جواہر موجود تھے لیکن ان مصنّفین نے خُود یا اس دَور کے کسی ناقد نے اِن کو انشائیہ قرار نہیں دیا اور وجہ یہ تھی کہ اس وقت "اِنشائیہ" کا لفظ اِس صنف کے ساتھ مناسب ارتباط حاصل نہیں کر سکا تھا۔ چُنانچہ یہ سب نثر پارے زمانۂ حال تک کسی نئی صنف کے نمائندہ ادب پارے شمار نہیں کیے گئے ہیں

نے ۱۹۸۵ء میں اپنی تالیف "انشائیہ اُردو ادب میں" پیش کی تو میں نے ان ادبا کو اور ان کے انشائیوں کو رسائل کے اوراق میں سے تلاش کیا اور انہیں انشائیہ نگاروں کی صف میں ہی نہیں بٹھایا بلکہ انہیں انشائیہ کے عبوری دَور کے نمائندے بھی تسلیم کیا۔ اور میں آج بھی اس بات کا اعتراف ضروری سمجھتا ہُوں کہ جدید انشائیہ کی بُنیاد رکھنے والوں میں ممتاز مفتی، داوٗد رہبر، جاوید صدیقی کی خدمات نظرانداز نہیں ہو سکتیں۔ وزیر آغا نے تو انشائیہ کی اس بنیاد پر ایک پُرشکوہ اور خوبصورت عمارت تعمیر کی ہے اور اِس عمارت کو آباد کرنے والے تخلیق کار پیدا کیے ہیں۔ چُنانچہ انشائیے کا جو بیج لندن سے سر سید احمد خاں لائے تھے۔ وُہ طویل عرصے تک ہندوستانی مٹّی میں لالہ خُود رو کی طرح اُگتا رہا۔ وزیر آغا نے اسے شجرِ ثمردار بنانے کی سعی کی۔ لیکن جب وُہ اپنی داخلی لگن سے یہ کام سرانجام دے رہے تھے تو خُود انہیں بھی علم نہیں تھا کہ وہ ادب کی پگڈنڈی پر کوئی نیا چراغ روشن کر رہے ہیں۔ چُنانچہ مولانا صلاح الدّین احمد نے فرمایا کہ۔

"رفیق گرامی ڈاکٹر وزیر آغا چند دنوں سے بعض بلند پایہ رسائل میں کچھ ایسے مضامین لکھ رہے تھے جنہیں پڑھ کر ناظر کی کیفیت کچھ اس بچّے کی سی ہو جاتی ہے جو اسکول میں دیر سے پہنچا ہو اور جس نے گھر کا کام بھی نہ کیا ہو۔ لیکن اس کے ہاتھوں پر بید پڑنے کے بجائے ان میں برفی اور قلاقند کے دو بڑے بڑے لفافے تھما دیئے جائیں..... ایک دن جب میں ان کا ایک پارۂ انشا (غالباً ــــ "لحاف") پڑھ کر اِسی بچّے کی سی کیفیت میں مُبتلا تھا...... یہ تجویز یک بیک میرے ذہن میں آئی کہ آغا صاحب کے ان بکھرے ہُوئے پاروں کو جمع کر کے ادبِ اردو کی ایک جدید ترین صنف کے اظہارِ اوّلیں کے طور پر اہلِ ذوق کی خدمت میں بر ملا پیش کر دیا جائے اور پھر ہر چہ بادا باد ــــــ!"

مولانا صلاح الدّین احمد نے یہ الفاظ وزیر آغا کے انشائیوں کے پہلے مجموعے "خیال پارے" کی "تقدیم" میں ۱۹۶۱ء میں لکھے اور اس کتاب کے انشائیوں کو اس جدید ترین صنف کے اظہارِ اوّلیں کی مثال قرار دیا۔ اسی سے بعد کے بیشتر ناقدین نے وزیر آغا کو اُردو انشائیے کا بانی قرار دیا۔ اور

مولانا صلاح الدین احمد نے جو "ہرچہ بادا باد" کے پیغمبرانہ الفاظ فرمائے تھے وہ بھی سچ ثابت ہوئے، وزیر آغا نے نہ صرف خود انشائیے لکھے بلکہ انشائیہ کا مزاج کچھ اس طرح نکھارا کہ اس کے نقوشِ فن انگریزی انشائیہ سے مختلف ہوتے چلے گئے۔ اس صنف کی قدیم انگریزی تعریف میں معتدبہ تبدیلی رونما ہو گئی اور اس کا دائرہ فن و عمل مشرقی ہوتا چلا گیا۔ چنانچہ اردو ادب میں "خیال پارے" کی اشاعت کے سال ۱۹۶۱ء کو انشائیہ کا نقطۂ آغاز قرار دیا جاتا ہے تو یہ مولانا صلاح الدین احمد کے بیان کی روشنی میں درست ہے۔ اور وزیر آغا کو اس صنف کا بانی قرار دیا جاتا ہے تو یہ بھی صحیح ہے۔ وجہ یہ کہ وزیر آغا نے جس نوع کے انشائیہ کی بنا ڈالی تھی اس کا سلسلۂ فن ایک ہی مقام پر اور ایک شخص تک رک نہیں گیا بلکہ گزشتہ ستائیس سال کے عرصے میں متعدد انشائیہ نگار افقِ ادب پر طلوع ہوئے اور اب جب کہ بعض انشائیہ نگاروں کی اولاد میں بھی اس صنف کے تخلیقی اوصاف پیدا ہو گئے ہیں تو یہ کہنا بھی درست ہے کہ وزیر آغا "صاحبِ سلسلہ" انشائیہ نگار ہیں۔ ان کے بنا کردہ انشائیہ کی نسل آگے بڑھ رہی ہے۔ انشائیہ کا خاندان وسعت پذیر ہے۔ میں سرسید کو یہ اعزاز دینے سے قاصر ہوں۔ وجہ یہ کہ ان کے اپنے عہد میں ڈپٹی نذیر احمد، مولانا الطاف حسین حالیؔ، مولوی ذکاء اللہ جیسے نثر نگار موجود تھے۔ لیکن ان میں سے کسی نے سرسید کی انشائیہ نگاری کے فن کو سنجیدگی سے قبول نہیں کیا۔ چنانچہ سرسید انشائیہ نگاری میں لاولد ہی رہے اور ان کا ذاتی سلسلۂ فن آگے نہیں بڑھ سکا۔ ہمارے عہد میں بھی جب کسی ادیب کو بیک وقت انشائیے کا مبتدی اور منتہی کہہ دیا جاتا ہے تو بالواسطہ طور پہ یہ باور کرانا مقصود ہوتا ہے کہ حضور آپ کی "روشنیٔ طبع" خود آپ تک محدود ہے اور یہ لکیر آگے بڑھنے کی داخلی قوت نہیں رکھتی۔

انشائیہ نگار کی حیثیت میں وزیر آغا نے جذبے کو اپنی شخصیت کا لمسِ فراواں عطا کیا اور خیال کی نازک موجوں کو ہر چہار جانب بے پروا حرکت کی اجازت دی تو اس عمل میں ان کی ذات باندازِ دگر منکشف ہوتی چلی گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وزیر آغا نے اپنی نظرِ خارج میں پھیلی ہوئی بسیط کائنات پر مرکوز رکھی اور فطرت کے عناصرِ کثیر کو اپنے داخل میں اترنے کا موقعہ دیا۔

ان کا مشاہدہ جب ان کے اعماق سے انشائیے کی صورت میں برآمد ہوا تو اس میں ایسی سچائیاں موجود تھیں جن کے بہتر اظہار کے لیے انشائیہ ہی وزیر آغا کے تخلیقی عمل کی معاونت کر سکتا تھا چنانچہ اُنہوں نے "آندھی" ۔ "جھکڑا" ۔ "دھند" ۔ "لحاف" ۔ "بہادری" ۔ "ریلوے ٹائم ٹیبل" اور "گرمی" جیسے معمولی موضوعات کو مس کیا تو ان کے ایسے بوقلموں گوشے دریافت کیے کہ موضوع جگمگا اٹھا اور غیر معمولی محسوس ہونے لگا۔ ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی نے "خیال پارے" کو پڑھا تو اُنہوں نے لکھا کہ

"انشائیہ نگاری کی بنیادی شرائط کو وزیر آغا نے "خیال پارے" میں برتنے کی کوشش کی ہے۔ موضوعات اور طرز نگارش دونوں اعتبار سے اِن کے یہاں اِنشائیہ کی رُوح ملتی ہے۔ وزیر آغا کے ان مضامین کو جُوں جُوں پڑھتے جائیے اُن جانی بُوجھی اور روزانہ کی دیکھی اور آزمائی ہوئی چیزوں کے بارے میں احساس ہو گا کہ ہم انہیں پہلی بار دیکھ رہے ہیں یا اس سے پہلے ہم نے انہیں اِس زاویے سے کیوں نہ دیکھا۔ تازگی اور تازہ کاری کا یہ عنصر ان مضامین کا نُمایاں وصف ہے"۔

بالفاظِ دیگر خلیل الرحمٰن اعظمی نے ہمیں یہ باور کرانے کی سعی کی ہے کہ وزیر آغا ہماری دیکھی ہوئی چیزوں پر ہی نظر ڈالتے ہیں لیکن جب وُہ ہمیں اپنے مُشاہدات اور تاثرات میں شریک ہونے کا موقع دیتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ ہم ان مظاہر اور اشیا کو شاید پہلی بار دیکھ رہے ہیں یا ہم نے انہیں پہلے اس زاویے یا اس نظر سے نہیں دیکھا تھا۔ چنانچہ جب وزیر آغا نے بہادری اور بے وقوفی میں کوئی بڑی خلیج حائل نہ دیکھی اور "ترتیب" میں تصنع، اغماض اور بے رُخی کا مُشاہدہ کیا اور "ریلوے ٹائم ٹیبل" کو سب سے دلچسپ کتاب قرار دیا تو ڈاکٹر سلیم اختر بھی کھل اٹھے اور اُنہوں نے نہ صرف "جھکڑا" ۔ "وہ" ۔ "بہادری" ۔ "آسیب" ۔ "پنسل کی معیت میں" اور "اجنبی دیار میں" وغیرہ انشائیوں کے عنوان بطور مثال اقتباس کیے بلکہ وزیر آغا کے اِنشائیہ "چالیسویں سالگرہ" کو چارلس لیمب کی کلاسیکی حیثیت کی مثال بھی قرار دے دیا۔ اور لکھا کہ

اِنشائیہ نگاری کے فروغ میں ڈاکٹر وزیر آغا اپنے وجُود میں ایک تحریک ہیں:
"خیال پارے" میں وزیر آغا ہمیں انشائیہ نگاری کی دہلیز پر کھڑے نظر آتے ہیں۔ وُہ اشیا

اور مظاہر کے اس نئے رُوپ کو پیش کرنے کی سعی کر رہے ہیں۔ جو ان کے دیدۂ حیراں سے نکل کر ہمارے سامنے آ رہا ہے۔ "خیال پارے" کے مضامین ان کے ابتدائی انشائیے ہیں لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ عرصے تک اِنہیں مضامین کو اس نئی صنف کے مثالی نمونے قرار دیا گیا۔

"خیال پارے" اور "چوری سے یاری تک" کے اِنشائیوں میں پانچ سال کا زمانی فاصلہ ہے۔ اِس عرصے میں وزیر آغا نے "سیّاح" ۔ "یہ معصوم لوگ" "درمیانہ درجہ" "فٹ پاتھ" "کچھ رشتہ داروں کی شان میں" - "میری چالیسویں سالگرہ" ۔ "دیوار" ۔ "طوطا پالنا" اور "چوری سے یاری تک" جیسے انشائیے لکھے اور ان میں جزو کے وسیلے سے ایک بڑے "کُل" کا تعارف کرانے کی سعی کی اس دور میں ان کا اِنشائیہ زمین سے اپنے پاؤں چھڑانے کی کوشش کرتا ہے اور وہ عمودی سمت میں سفر پیما محسوس ہوتے ہیں۔ چنانچہ اب وہ فطرت کے ان بُوقلموں رازوں میں شرکت کے متمنّی ہیں جن تک ایک عام اِنسان کی نظر نہیں جاتی۔ وزیر آغا کے لئے فطرت کے اسرار سے آگہی کا ایک بڑا وسیلہ دیہات ہے۔ ان کے اِنشائیوں میں دیہات ایک عقبی دیار بھی ہے اور یہ فطرت کے حُسن اور اس کی دلآویزیوں کو سمیٹنے کا وسیلہ بھی ہے۔ دیہات ایک ایسی انجمن ہے جہاں اِنسان کبھی تنہا نہیں ہوتا۔ وزیر آغا کے لئے یہ احساس خاصہ تلخ ہے کہ فطرت اور اِنسان کے درمیان شہر نے ایک اُونچی دیوار کھڑی کر دی ہے۔ فطرت کے التفات سے محروم ہو جانے کا جو احساس جاگتا ہے اِس کی طرف وزیر آغا نے اِنشائیہ "فٹ پاتھ" میں یُوں اشارا کیا ہے۔

> "جب سُرخ ساڑھی میں لپٹی ہُوئی شام آسمان کے بام و دَر سے لحظہ بھر کے لئے جھانکتی ہے تو میں چھڑی ہاتھ میں لئے، گنجان سڑک کے ساتھ چمٹے ہُوئے فٹ پاتھ پر چہل قدمی کے لئے نکل آتا ہُوں۔ اِس امید کے ساتھ کہ شاید میں آج اس حسینۂ فلک کے درشن کر سکوں لیکن آسمان سے آنکھ مچولی کھیلتی ہوئی دیواروں کے اِس شہر میں میری نظریں اس تک پہنچ ہی نہیں پاتیں۔ اِس کے بجائے میں اس سیاہ پوش، بپھرے ہُوئے جمِ غفیر کا نظارہ کر کے لَوٹ آتا

ہوں جو میرے دائیں ہاتھ بہتی ہوئی سڑک پر سائیکلوں، تانگوں، موٹروں، سکوٹروں اور رکشاؤں کی صورت میں رواں دواں ہیں۔ اس وقت مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں کسی تیز رفتار پہاڑی دریا کے کنارے یا متلاطم سمندر میں گھرے ہوئے کسی خاموش اور تنہا جزیرے میں کھڑا سرکش موجوں کا نظارہ کر رہا ہوں۔"

——— "فٹ پاتھ"

آپ نے دیکھا کہ "دیوار" جیسے غیر اہم اور معمولی موضوع کو جب وزیر آغا نے ہجوم کی دیوار اور عمارتوں کی آسمان سے آنکھ مچولی کھیلتی ہوئی دیواروں سے تعلق قائم کیا تو "دیوار" کے غیر اہم موضوع کو بھی فنّی اہمیّت مل گئی اور اب حقیقت کو اپنی نمود کا ایک نیا زاویہ مل گیا۔ اس قسم کے انکشافِ حقیقت کے متعدّد زاویے وزیر آغا کے انشائیوں میں بکھرے پڑے ہیں۔ ان میں عرفانِ حقیقت بھی ہے اور ادراکِ دانش بھی۔ "خیال پارے" میں وزیر آغا نے اشیا اور مظاہر کو دیکھا۔ "چوری سے یاری تک" کے انشائیوں میں اُنھوں نے حقیقت کے داخل سے اس غنچے کو تلاش کیا ہے جو کھلے تو پھول بن جاتا ہے اور جس کی خوشبو اطراف و جوانب کو معطّر کر دیتی ہے۔ مثال کے طور پر یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے۔

"تقسیم کا وصف عورت کی فطرت میں شامل ہے۔ جس طرح دھرتی ایک بیج کو سینکڑوں میں تقسیم کر دیتی ہے اور درخت خود کو لاکھوں شاخوں اور پتوں میں بانٹ دیتا ہے۔ بعینہٖ عورت ازل سے اپنے گھر کو کوٹھڑیوں میں اور سامان کو پوٹلیوں میں تقسیم کرتی آئی ہے۔"

——— "سیّاح"

"فی الحال یہ دیکھئے کہ میں نے زندگی کو تین اہم ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا وہ دور جس میں آپ کبوتر پالتے (بلکہ اڑاتے) ہیں۔ دوسرا وہ دور جس میں مرغ پالتے (بلکہ لڑاتے) ہیں، تیسرا وہ دور جس میں آپ طوطا پالتے ہیں اور گھنٹوں بڑبڑاتے ہیں، اُڑانے، لڑانے اور بڑبڑانے کی انہیں تینوں

مدارج سے یہ زندگی عبارت ہے۔"

——— "طوطا پالنا"

"خدا کی قدرت ہے کہ رشتہ دار تو آسمان سے نازل ہوتے ہیں لیکن دوست احباب زمین سے اُگتے ہیں۔۔۔۔۔ رشتہ دار اللہ میاں کی طرف سے عطا ہوتے ہیں اور آپ چاہیں یا نہ چاہیں وہ بزورِ شمشیر آپ سے اپنی رشتہ داری قائم رکھتے ہیں۔ لیکن دوست احباب کے انتخاب میں اللہ میاں قطعاً دخل نہیں دیتا۔ اور بعد ازاں جب آپ اللہ سے دُعا مانگتے ہیں کہ اے مظہر العجائب! تو مجھے اِس آفت سے بچا تو وُہ مسکرا کر آپ کی بات سُنی ان سُنی کر دیتا ہے"

——— "کچھ رشتہ داروں کی شان میں"

یہ اقتباسات اِس حقیقت کے مظہر ہیں کہ وزیر آغا موجود کی ہیئت کو تبدیل نہیں کرتے بلکہ وہ موجود کے نئے زاویے دکھاتے ہیں اور مخفی مفہوم کو ایک نیا دائرہ نور عطا کر دیتے ہیں۔ چنانچہ یوسف ظفر نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ وزیر آغا نے انشائیہ اِس لئے لکھا ہے کہ۔

"زندگی کی وسعتوں، اس کی ہمہ گیری اور گہرائی، اِس کے ادنیٰ سے ادنیٰ پہلو کے معمولی جزو کے ناقص سے ناقص نقطے کو بھی دائرۂ امکان بنا دیں اور اِس کے محرابوں میں قندیل ہائے خیال کا ایک سلسلہ اس طرح فروزاں کریں کہ ذہن کا ہر زاویہ خانۂ آفتاب بن جائے۔"

اِنشائیہ سے معنی کی نئی گرہ کھولنے کے لئے وزیر آغا بالعموم موضوع کو اُلٹنے پلٹنے کے بجائے اپنے مشاہدے کا زاویہ تبدیل کر دیتے ہیں۔ روشنیوں اور سایوں کے اس نئے امتزاج سے مظاہر اور اشیا کا پیکر تو یقیناً تبدیل نہیں ہوتا۔ لیکن اب جو رُوپ ہمارے سامنے آتا ہے اور جو حقیقت آشکار ہوتی ہے اِس کی معنویت یقیناً نئی ہوتی ہے۔ میں اس کی ایک مثال اِنشائیہ "واپسی" سے پیش کروں گا۔ لکھتے ہیں کہ:

"فلاسفروں نے زندگی کے ہر مظہر کو واپسی کے عمل میں مُبتلا دکھایا ہے اور

اس ضمن میں ریاضی کے ہندسوں اور اقلیدس کی لکیروں سے کچھ تجریدی مصوّری بھی کی ہے جو خوش قسمتی سے میری اور آپ کی سمجھ سے بالا ہے۔ لیکن ان کے نتائج کو تسلیم کرنے میں لطف سا محسوس ہوتا ہے۔۔۔۔ مثلاً "الف" اگر اپنی نسل آگے پھیلانا چاہتا ہے تو سمٹ کر اپنے بیٹے کا روپ اختیار کرے۔ اگر "ج" کوئی نمایاں تخلیقی کارنامہ سرانجام دینے کے مرض میں مبتلا ہے تو اوّلیں فرصت میں اپنی ذات کی انڈر گراؤنڈ ٹرین کا ٹکٹ کٹائے اور وہاں سے روشنی کی مشعل لے کر باہر آجائے۔ "پ" خلقِ خدا کو سچائی کا راستہ دکھانے کا آرزومند ہے تو کسی بڑ کے درخت، کسی مچھلی کے پیٹ، کسی کشتی یا ریگستان کی طرف مراجعت کرے۔۔۔۔"

"واپسی" ——

وزیر آغا نے انشائیے پر طنز و مزاح کے غلبے کو کبھی قبول نہیں کیا۔ وہ مصنّف کو اپنی فطری صورت بگاڑنے کا کبھی مشورہ نہیں دیتے، انہوں نے انشائیہ نگار کو احساسِ تفاخر میں مبتلا ہونے اور دوسروں کو حقارت کی طنز آمیز نظر سے دیکھنے کی اجازت بھی نہیں دی۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ انہوں اپنے انشائیوں میں لطیف مزاح اور سبک طنز سے ہمیشہ فائدہ اٹھایا ہے اور ایسی شگفتگی کو جنم دیا ہے جس سے پامال موضوع بھی تازہ کار ہو جاتا ہے۔ یوسف ظفر نے لکھا تھا کہ "وزیر آغا نے پطرس کے مضامین" اور تھامس ایرسن کے علمی مضامین کے بین بین ایک روش وضع کی جس کا ایک مفہوم یہ ہے کہ وزیر آغا کے ہاں علمی تفکر بوجھل نہیں ہونے پاتا۔ ان کا تخلیقی اسلوب محض انشائیہ کی تکنیکی ضرورت کو پورا نہیں کرتا بلکہ یہ ان کی عمر بھر کی ریاضت کا ثمر اور تہذیبی شخصیت کا پرتو بھی ہے۔ طنز و مزاح ان کے اسلوب میں مقصود بالذات کبھی نہیں بنتے بلکہ وزیر آغا ان کے محتاط استعمال سے شگفتگی پیدا کرتے اور قاری کو شائستہ انداز میں مسکرانے کا موقعہ دیتے ہیں۔ وہ مزاح یا طنز کو موضوع پر مسلّط نہیں کرتے بلکہ یہ ان کے شگفتہ اور جان دار تخلیقی اسلوب کا حصّہ ہے اور

یہ موضوع کے داخل سے اس طرح نکل کر سامنے آتا ہے جیسے پھول کے بطون سے خوشبو ہماری طرف آجاتی ہے۔ اس کی ایک مثال ان کے انشائیہ "چوری سے یاری تک" سے ملاحظہ کیجئے۔

"چوری ہمارا پیشہ ہی نہیں مشغلہ بھی ہے اور ہم نے لیل و نہار کی ہزار کروٹوں کے باوجود نہ صرف اسے زندہ رکھا ہے بلکہ اس میں لاتعداد موشگافیاں اور فنّی باریکیاں بھی پیدا کی ہیں۔ دروغ بر گردنِ راوی۔ لیکن یہی سُنا ہے کہ ہمارے اِس پیشے کا ذکر رگ وید میں بھی موجود ہے۔ آریا جب ہم پر حملہ آور ہوئے اور ہمارے قلعوں کو برباد کرتے چلے گئے تو جواباً اور انتقاماً ہم نے بھی ان کے مویشی چرانے شروع کر دیئے۔ ہم نے انہیں اس قدر پریشان کیا کہ وہ اپنے اشلوکوں میں برکھا اور دودھ اور فرزند کے لئے دعائیں مانگنے کے ہمیں بد دعائیں دینا شروع ہو گئے۔"

—— "چوری سے یاری تک"

وزیر آغا کے اِنشائیوں کا تجزیہ کرتے ہوئے قیوم نظر نے لکھا ہے کہ۔

"ان کے اِنشائیوں میں زندگی بسر کرنے کا ڈھنگ یا اس کا فلسفہ، نئی اور پرانی اقدار کا تقابل، اقتصادی مسائل سے آگاہی، تہذیبی سلسلوں کا شعور، معتدل اندازِ بیاں، تشبیہات اور استعارات کا استعمال، ہلکے پھلکے مزاح کی چاشنی یہ سب مل ملا کر پڑھنے والے کو خوش مزگی کے عالم میں اپنے گردوپیش کا جائزہ لینے پر اکساتی ہیں۔"

مشتاق احمد یوسفی نے کہا کہ

"سخت سے سخت بات کو نرم انداز میں کہنے کا یہ طرز کم ادیبوں کو نصیب ہوتا ہے۔ وہ لڑتے ہیں مگر اس سادگی سے کہ اپنی تلوار کو بے نیام نہیں ہونے دیتے۔ مزاح ان کے لئے سیف نہیں سپر ہے۔"

وزیر آغا کے اِنشائیے کی آخری خوبی یہ ہے کہ اس میں فکری موشگافی اور نکتہ آفرینی کے

عناصر بیشتر انشائیہ نگاروں سے زیادہ ہیں۔ وہ ایک نکتے کو دُوسرے نکتے سے اسی طرح ملاتے ہیں جیسے برق کی مثبت اور منفی تاریں آپس میں ملتی ہیں اور روشنی پیدا کر دیتی ہیں۔ ان کا انشائیہ کسی مخصوص سمت کی طرف جلوہ نمائی نہیں کرتا۔ بلکہ یہ گرد و پیش کے متعدد موضوعات کو مس کرتا چلا جاتا ہے۔ وہ قیدِ مقام سے آزاد ہو جاتے ہیں، زمان کی گرفت اُنہیں اپنے حصار میں نہیں لیتی۔ موضوع بے پر جذبے کی طرح ہوا میں بے تکان پرواز کرتا ہے لیکن اپنے قاری کی طرف آکسیجن کی وافر مقدار پھینکتا چلا جاتا ہے۔ چُنانچہ جب ان کے انشائیوں کا دُوسرا مجموعہ "چوری سے یاری تک" چھپا تو ممتاز مزاح نگار مشتاق احمد یُوسفی نے لکھا کہ۔

"مضامینِ نو کا یہ مجموعہ اپنی تازگی اور توازنِ فکر و نظر کے لحاظ سے اُردو ادب میں یادگار رہے گا۔"

مُشتاق احمد یُوسفی ان مضامین کی ندرت و بہجت سے اتنے متاثر ہُوئے کہ اُنہوں نے لکھا کہ اگر یہ کہا جائے کہ وزیر آغا اُردو میں اس صنفِ ادب (ایسیے) کے موجد بھی ہیں اور خاتم بھی تو بے جا نہیں ہو گا ــــــ"

خُدا کا شکر ہے کہ وزیر آغا نے یُوسفی صاحب کی رائے کو اپنے فنِ انشائیہ کا انتہائی نقطہ قرار نہیں دیا۔ نہ اس سرٹیفکیٹ کو اپنے ماتھے پر مستقلاً سجا کر خلقِ خُدا پر عرصۂ فن تنگ کیا ہے بلکہ اُنہوں نے "چوری سے یاری تک" کے انشائیوں سے گُزر کر ارتقا کی طرف ایک اور قدم بڑھایا اور "دُوسرا کنارہ" کے عنوان سے نہ صرف انشائیوں کا ایک نیا مجمُوعہ پیش کیا بلکہ اس عرصے میں اُردو ادب کو متعدد نئے انشائیہ نگاروں سے متعارف کرا کے ثابت کر دیا کہ وُہ اس صنفِ ادب کے خاتم نہیں بلکہ اس کے ارتقا میں معاونت کرنے والے اور اس کا مدارِ فن وسیع کرنے والے ادیب ہیں اور تا حال اُنہیں خُود بھی پتہ نہیں کہ۔

"منزل ہے کہاں تیری اے لالۂ صحرائی"

اِنشائیہ کی تکنیک

——— ڈاکٹر سلیم اختر

اُردو انشائیے کے بارے میں چھپنے والی تحریروں میں بالعموم اِنشائیہ کی تکنیک کے یہ لوازم گنوائے جاتے ہیں۔

غیر ضروری طوالت نہ ہو۔ ناتمامی کا احساس ہو۔ ٹھوس اور مدلّل لہجہ نہ ہو۔ موضوعات میں تنوّع ہو۔ غیر رسمی اندازِ گفتگو سے مشابہ ہو۔ شخصی نقطۂ نظر ہو اور شگفتگی تو ہو مگر طنز اور مزاح کے بغیر۔ یہ اور ایسی ہی دیگر خصوصیات جو اپنی جزوی حیثیت میں دُرست ہونے کے باوجود بھی اپنے کُل سے وابستہ وسیع تر مفہوم میں "قطعی" یا "آخری" نہیں قرار پاتیں۔ سیدھی سی وجہ یہ ہے کہ کسی بھی فن پارہ یا الفاظ سے معرضِ وجود میں آنے والی تخلیق میں تکنیک (فارم، ہیئت، صُورت یا اور کوئی اصطلاح استعمال کر لیجئے) محض مقصود بالذات نہیں ہوتی بلکہ اس کا بنیادی مقصد تخلیقی عمل کے "محیطِ بے کراں" کو تخلیق کی "ذرا سی آب جو" میں مقید کرنا ہوتا ہے۔ اور یہ تخلیقی عمل کس طرح سے تخلیقی شخصیت پر حاوی ہو جاتا ہے۔ اِس کا اندازہ یونگ کے اس بیان سے لگایا جا سکتا ہے۔

"تخلیق کاروں کے تجزیاتی مطالعے سے لاشعور سے پھوٹنے والی تخلیقی تحریک کی توانائی

ہی واضح نہیں ہوتی بلکہ اس کی زشت خوئی اور تلون پر بھی روشنی پڑتی ہے تخلیق کار کی رُوح میں خوابیدہ فن پارہ فطرت کی وُہ قوت ہے جو حصُولِ مقصد کے لئے کبھی جبر سے کام لیتی ہے تو کبھی فطرت ہی کی مانند نرم روی سے، اس سلسلے میں حصُولِ مقصد کے لئے تخلیقی قوّت کا ذریعہ بننے والے فن کار کی اذیّت کا بھی کوئی خیال نہیں رکھا جاتا.... اس لحاظ سے تخلیقی عمل کو ایسی زندہ شئے تصوّر کرنا چاہیئے جو انسان کی رُوح میں ہوتی ہے[1]۔"

یونگ تخلیقی عمل کا مطالعہ کرتے وقت اس حد تک جاتا ہے کہ اس کے بموجب تو تخلیقی عمل اور تخلیق کار ایک ہو جاتے ہیں۔ اس کے بقول

"شاعر تخلیقی عمل سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے[2]۔"

یہ دُرست کہ یونگ نے یہ خالص تخلیق کار یعنی شاعر کے بارے میں لکھا ہے۔ انشائیہ نگار کے بارے میں نہیں۔ تاہم ہر نوع کا تحریری عمل کسی نہ کسی تخلیقی عمل کے تابع تو ہوتا ہی ہے۔ البتہ تخلیقی عمل کی شدّت کے مختلف مدارج ہو سکتے ہیں۔ جب تخلیقی عمل کی پُرقوت شدّت اور اس سے جنم لینے والے جبر کا یہ عالم ہو کہ "آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے۔" تو ایسی صورت میں تکنیک مقصُود بالذات قرار پانے کے برعکس حصُولِ مقصد کا ایک ذریعہ ہی بن سکتی ہے۔ اس لئے جب کسی بھی تخلیقی کارکردگی میں شعُوری طور پہ خُود کو "مقصد تحریر" کے تابع کر لیا جائے یا تکنیک کے ضوابط اعصاب پر سوار ہو جائیں تو پھر تخلیق مقصد اور تکنیک کی محض ضمنی پیداوار بن کر رہ جائے گی۔ یُوں شعر نعرہ میں تبدیل ہو جائے گا۔ استعارہ تازگی گنوا بیٹھے گا اور تحریر کو بیوست کی گھن لگ جائے گی۔ جب غالبؔ نے یہ کہا۔

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کُچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے

تو در اصل وہ بھی تخلیق پر تکنیک کے حاوی ہونے کی بات کر رہا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر اچھے' بڑے اور خالص تخلیق کار نے فن کے بُنیادی تقاضوں سے انحراف کئے بغیر اس کی تکنیک سے

---

1. Modern Man in Search of A Soul" P.186-187

۲۔ ایضاً۔ ص ۲۳۸

جنم لینے والے جبر سے آزاد ہونے کی کوشش کی۔ نظم کہاں سے چلی اور نثری نظم تک آپہنچی۔ بھارت میں تو اب آزاد غزل بھی لکھی جارہی ہے۔ اس طرح فکشن میں تکنیک کا جو تنوّع نظر آتا ہے اس کا بُنیادی سبب بھی یہی ہے کہ کوئی اچھا تخلیق کار "بوتل کا جن" بن کر نہیں رہ سکتا۔ اور سو باتوں کی بات تو یہ ہے کہ تکنیک تخلیق کے تابع ہے اور ہونی بھی چاہیئے۔ ہر تخلیق اپنی تکنیک کو خُود جنم دیتی ہے اور وہ تخلیق کے مزاج سے ہم آہنگ ہوتی ہے۔ وُہ جو اچھا عروضی اچھا شاعر نہیں ہو سکتا تو اس کا سبب بھی یہی ہے۔

تکنیک کیا ہے؟ چند اصُولوں اور ضوابط ہی کا نام تو تکنیک ہے اور تکنیک یا اس کے ضوابط محض اس لیئے معرضِ وجُود میں آئے کہ تخلیقی عمل کے لاشعُوری محرکات سے تخلیق کی سیال ذہنی صوُرت کو ایک جانے پہچانے پیکر میں پیش کیا جا سکے تا کہ وہ قارئین، سامعین اور ناظرین کے لیئے قابلِ قبول بن سکے۔ اس لیئے تو تخلیق اور کوزہ گری میں فرق ہوتا ہے کہ تخلیق سے وابستہ عمل دیگر اعصابی اعمال سے ارفع ہی نہیں ہوتا بلکہ انسانی شخصیت کا عظیم ترین اور خُود مختار عمل بھی ہے۔ ایسا عمل جس کے پر لگا کر انسانی شخصیت جب تخلیقی شخصیت میں تبدیل ہوتی ہے تو خالق سے بھی ہم سری کا دعویٰ کر سکتی ہے۔

تو شب آفریدی چراغ آفریدم

کوزہ گر کا عمل میکانکی ہے۔ اس لیئے وُہ غیر تخلیقی ہے اور اگر ایک ادیب اپنی سطحیت یا میکانکی مہارت سے تخلیق کے نام پر محض کوزہ گری کرتا ہے تو وُہ خالص تخلیق کار کے برعکس کاذب تخلیق کار کہلائے گا۔ اور ہر خالص تخلیق میں تکنیک کا یہ عالم ہے "گاہے گاہے غلط آہنگ بھی ہوتا ہے سروش"۔ اس لیئے ہر عہد میں ادب میں مسلمات کے خلاف بغاوت ہوتی رہی ہے۔

اور "نہ جنبد گُل محمد" قسم کے متحجر ذہن رکھنے والے قلمکاروں کے مقابلے میں اُسلوب اور تکنیک میں تجربات کرنے والے باغیوں نے تمام تر نزاعات یا مُستردکر دیئے جانے کے باوجُود بھی بالآخر "AVANT-GRADE" کی حیثیت سے منفرد مقام حاصل کر لیا۔ میراجی واحد مثال نہیں۔

اِس تناظر میں معاصر انشائیہ کا مطالعہ کرنے پر جو یہ احساس ہوتا ہے کہ "پاسبانِ عقل" کبھی اِسے تنہا نہیں چھوڑتا تو اِس کا بنیادی سبب بھی تکنیک کو مقصود بالذات سمجھ لینے میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ مگر حقیقت اِس کے برعکس ہے کہ تکنیک کے لوازم ہیئت کے اصول اور فارم کے ضوابط خارجی تو ہیں لیکن اُنہیں بروئے کار لانے کا سلیقہ داخلی ہوتا ہے۔ یہ تخلیق کار (اور اس میں اِنشائیہ نگار بھی شامل ہے) کی تخلیقی شخصیت کی توانائی ہی تو ہے جو اسے تکنیک پر حاوی ہونے والا اسمِ اعظم سکھاتی ہے۔ اِسی لیے بڑا تخلیق کار کبھی بھی تکنیک کے سومنات کے سامنے ایک پجاری کی مانند دست بستہ نہیں کھڑا ہوتا۔ اِسی لیے وہ پتھر کی بھاری سِل بننے کے برعکس اِس کے ہاتھوں میں گیلی اور پُر لوچ مٹّی ثابت ہوتی ہے جو اس کے لاشعور کے چاک پر انوکھی وضع اور نئے رُوپ اختیار کرتی جاتی ہے اور علامہ اقبال تو اِس سے بھی آگے نکل گئے کہ وُہ تو —— خُونِ جگر سل کو بناتا ہے دل —— کے قائل ہیں اور اِسی سے ایک عام نظم گو اور اقبال، ایک عام غزل گو اور غالب، ایک عام ناول نگار اور قرۃ العین حیدر۔ ایک عام افسانہ نگار اور راجندر سنگھ بیدی اور ایک عام اِنشائیہ نگار اور چارلس لیمب میں فرق پیدا ہوتا ہے۔ یہ تو خیر بڑے نام اور بڑی مثالیں ہیں اپنا عالم تو یہ ہے کہ ابھی تک یہ طے نہیں کیا جا سکا کہ اِنشائیہ میں طنز اور مزاح کا کردار کیا ہو! یہ اِنشائیہ میں ہوں کہ اُنہیں اِنشائیہ کی مملکت سے جلاوطن کر دیا جائے؟ اور اِسی لیے اِنشائیہ کے نقاد یہ فیصلہ نہ کر پاتے کہ طنز و مزاح کی پھلواری میں اِنشائیہ کا پھُول اگر کھِلتا ہے تو کیا رنگ لاتا ہے؟ اگر ایک لمحہ کے لیے طنز و مزاح اور انشائیہ سے وابستہ تخلیقی محرکات اور فنّی مقاصد سے صرفِ نظر کرتے ہُوئے صرف تکنیک کو ملحوظ رکھیں تو طنز و مزاح میں اظہار کی جو متنوّع صُورتیں دکھائی دیں گی۔ اُن میں ایک انتہا پر اگر لطیفہ ہوگا۔ تو دُوسری انتہا پر اِنشائیہ۔

طنز و مزاح کی خالص صُورت کو اگر کوئی نام دینا ہو تو لطیفہ سے موزوں اور کوئی نام نہیں ہو سکتا۔ لطیفہ اِس بنا پر طنز و مزاح کی خالص ترین صُورت قرار پاتا ہے کہ اِس کی کوئی

معین تکنیک اور مخصوص اُسلوب نہیں ہے۔ اِسی لِئے لاہیئتی (FORM LESSNESS) اس کا وصفِ خاص تو بے اُسلوبی نشانِ امتیاز! بلحاظ آغاز لطیفہ خُود رَو پودوں کی مانند ہے۔ وُہ خود رو پودے جو دستِ باغبان کے مرہونِ منّت نہیں ہوتے اور نہ ہی نشو و نما کے لِئے طالبِ کشت۔ اِسی لِئے یہ کبھی بھی گُل دانوں میں نہیں سجائے جاتے۔ لوک گیتوں کی مانند لطیفوں کا بھی کوئی خالق نہیں ہوتا اور نہ ہی شعوری کاوش سے انہیں تخلیق کیا جاتا ہے لیکن کمال یہ ہے کہ کسی بھی معاشرہ کے مخصُوص لطیفوں سے اس معاشرے کے اجتماعی رویّے سمجھے جا سکتے ہیں۔ لطیفے کا حُسن اس کی بے ساختگی میں ہے چُنانچہ اِس لحاظ سے تو واقعی اِسے ہنسی کا فوارہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

لطیفہ کے برعکس طنز و مزاح کے کئی اسالیب دکھائی دیں گے۔ جیسے جیسے طنز و مزاح میں لطافت پیدا ہوتی جائے گی اور اُسلوب کی ملائمت میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ لطیفے کا بے ساختہ پن بھی ختم ہوتا جائے گا اور تکنیک اور اُسلوب کے تجربات کی مناسبت سے لطیفہ کی لاہیئتی بھی ختم ہوتی جائے گی۔ حتّٰی کہ شعوری کاوش سے تخلیق کئے گئے مزاح اور لطیفہ میں تکنیک کے لحاظ سے اتنا بُعد پیدا ہو جاتا ہے کہ ایک سانس میں دونوں کے نام بھی نہیں لئے جا سکتے۔

اِن دو انتہاؤں میں اِنشائیہ کا مطالعہ کرنے پر واضح ہو جاتا ہے کہ انشائیہ میں طنز و مزاح اپنی لطیف ترین صُورت میں رنگ آمیزی کرتے ہیں۔ اِنشائیہ کے لِئے خوش گفتگی کو بہت ضروری خیال کیا جاتا ہے وُہ تبسّم زیرِ لب نہیں تو اور کیا ہے؟ اس لِئے طنز و مزاح کو اِنشائیہ کی قلم رو سے جلا وطن نہیں کیا جا سکتا کہ اگر یہ نہیں تو تبسّمِ زیرِ لب، شگفتگی، بہجت، حظ، مسرت وغیرہ کیسے پیدا ہوں گی؟ اب یہ الگ بات ہے کہ بعض اوقات طنز و مزاح یا ان سے جنم لینے والے تفنن کی لے اتنی دھیمی ہوتی ہے کہ کیفیت یہ ہو جاتی ہے۔

ے ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انشائیہ میں طنز کا واضح اور مزاح کا براہِ راست اظہار کیوں نہیں ہوتا؟
جہاں تک طنز و مزاح کا تعلق ہے تو اس کی کئی صورتیں ملتی ہیں اور یہ موضوع، اسلوب اور تکنیک سے متعلق ہوتی ہیں۔ اِدھر انشائیہ کی تکنیک میں جو لچک ملتی ہے اس کی بناء پر انشائیہ میں موضوع یا اسلوب پر کسی قسم کی قدغن نہیں، یعنی سورج تلے دھرتی کا ہر موضوع اپنایا جاسکتا ہے۔ اسی طرح اسلوب میں طنز و مزاح، سنجیدگی یا برعکس ہونے پر بھی کسی قسم کی پابندی عاید نہیں۔ صرف سلیقہ شرط ہے بلکہ انشائیہ کا تو لطف ہی اس کی آزادانہ روش، اسلوب کی تازگی اور لاہیئتی میں مضمر ہے۔

انشائیہ نگاری کے اپنے تقاضے ہیں جن سے اس کی تکنیک طے پاتی ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی طے ہے کہ کسی بھی صنف کی ترقی تکنیک اور اسلوب میں تجربات سے مشروط ہوتی ہے۔ اگر ادیب محض روایات کے پنجرے کا طوطا بن کر میاں مٹھو کہتا رہے۔ تکنیک اس کے لئے طلسمی حصار ثابت ہو اور وہ اسلوب میں محض گرامر کا پابند ہو کر رہ جائے تو اصناف کی ترقی اور نشو و نما کا عمل رک جاتا ہے۔ یہ عمومی اصول بحیثیت ایک صنف انشائیہ پر بھی لاگو ہوتا ہے۔ اور انشائیہ نگاروں کو بھی اپنی تخلیقی وژن سے کام لے کر مسلمات سے انحراف کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی کسی دیگر تخلیقی اصناف سے وابستہ تخلیق کاروں کو ہو سکتی ہے۔

میں ذاتی طور پر یہ محسوس کرتا ہوں کہ معاصر انشائیہ ضرورت سے زیادہ سنجیدہ ہے۔ غالباً اسی لئے اس کے اسلوب میں اب مزہ نہیں رہا اور بالعموم شگفتگی کا فقدان ملتا ہے۔ استثنائی مثالوں سے قطع نظر معاصر انشائیہ میں زندگی کا تنوع پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ انشائیہ نگار INCUBATER میں نہیں رہتا۔ اس لئے اسے جرأت اظہار سے کام لیکر اپنے عصر اور معاشرہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنی چاہئیں۔ موضوعات کی کمی نہیں اور ان عناصر کی بھی فراوانی ہے جن سے اسلوب میں طنز کی دھار تیز ہوتی ہے اور مزاح کی پھلجھڑیاں چلتی

ہیں تو پھر کیوں نہ اُن سے فائدہ اٹھایا جائے۔

اگر آج کوئی اچھا انشائیہ نہیں لکھ سکتا تو تکنیک کو اِس کا باعث نہیں قرار دیا جا سکتا۔ تکنیک جست لگانے کا انداز تو متعیّن کر سکتی ہے مگر جست کو ممکن نہیں بنا سکتی۔ جست تو مشروط ہوتی ہے توانائی سے وہ اعصابی توانائی جو تخلیقی شخصیّت کا وصفِ خاص ہوتی ہے۔ جس کی بدولت ادیب غیر تخلیقی افراد سے ممتاز قرار پاتا ہے اور جو اقبال کے الفاظ میں "عشق کی ایک جست" کہلاتی ہے۔ اچھا اِنشائیہ محض تکنیک سے نہیں لکھا جا سکتا بالکل اِسی طرح جیسے تکنیک کی وفاداری برے انشائیے کا جواز بھی نہیں بن سکتی۔ آیئے ایک مرتبہ پھر یونگ سے رجُوع کرتے ہیں جس نے تخلیق کار کے لِئے جو کچُھ کہا، اُسے اِنشائیہ نگار پر بھی منطبق کرنے کو جی چاہتا ہے۔

"بحیثیت ایک اِنسان وہ طبعی رجحانات، قوّتِ ارادی یا دیگر ذاتی عزائم کا حامل بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن تخلیق کار ہونے کی بنا پر وہ ارفع مفہوم میں ایک مَرد ہے۔ بلکہ وُہ تو اجتماعی مَرد ہے۔ وُہ انسانیت کی لاشعُوری اور نفسِ زندگی کو صُورت پذیر کرتا ہے[1]۔"

کیا ہم معاصر انشائیہ نگار کو یونگ کا "اجتماعی مرد" قرار دے سکتے ہیں؟ ہاتھ باندھ کر مُعافی مانگتا ہُوں کہ میرا جواب نفی میں ہے کہ ہمارا اِنشائیہ نگار ابھی تک "عشق کی اِک جست" کی لذّت سے ناآشنا ہے اور اِسی لِئے پا بہ گل ہے۔ وُہ جب تک معلُوم سے نامعلُوم تک جست کا حوصلہ پیدا نہیں کرتا ہمارے اِنشائیے کی صُورت بھی یہی رہے گی اور سیرت بھی۔

؎ تُو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا

---

1. Modern ·· in Search of A Soul P. 195

اُردو انشائیہ کی کہانی

—— ڈاکٹر وزیر آغا

آج سے کم و بیش چالیس برس پہلے اُردو انشائیہ کے خدو خال واضح ہونے شروع ہوئے۔ یہ نہیں کہ اُردو انشائیہ اس سے قبل اپنا کوئی الگ وجود رکھتا تھا اور کسی خزانے کی طرح زیرِ زمین پڑا تھا جسے کسی نے اتفاقاً دریافت کر کے اہلِ نظر کے سامنے پیش کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ تقسیمِ ملک سے پہلے طنزیہ مزاحیہ اور سنجیدہ مضمون بلکہ جواب مضمون لکھنے کی روش تو عام تھی جو کتابوں اور رسائل سے نکل کر آہستہ آہستہ اخباری کالموں اور شذروں کی صورت میں ڈھل رہی تھی۔ مگر سچ مچ کا انشائیہ اس سارے دَور میں کہیں بھی نظر نہیں آتا اور انشائیہ کی تحریک کا تو نام و نشان تک دکھائی نہیں دیتا۔ البتہ جب ۱۹۶۰ء کے لگ بھگ اُردو انشائیہ اپنے بھرپور انداز میں اُبھر کر سامنے آیا اور اُردو انشائیوں کا پہلا مجموعہ بھی شائع ہو گیا تو پوری اُردو دُنیا میں انشائیہ کی جڑوں کی تلاش کا سلسلہ فی الفور شروع کر دیا گیا۔ اِن ہی دنوں میں نے اِنشائیے کے اِمتیازی اوصاف کو واضح کرنے کے لئے متعدد مضامین لکھے اور ایک مضمون میں جو علی گڑھ میگزین کے اِنشائیہ نمبر میں چھپا، اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ گو اِنشائیہ کے عناصر تقسیم سے پہلے غیر افسانوی نثر میں جا بجا مل جاتے ہیں؛ لیکن سر سیّد احمد خاں کے مضامین سے لیکر تقسیمِ ملک تک لکھے گئے مضامین کے انبار

ہوئے جن میں انشائیہ کے مقتضیات کو ایک بڑی حد تک ملحوظ رکھا گیا تھا۔ لیکن ایک تو ان مضامین کا اسلوب انشائیہ کی تازگی (ان دنوں میں لفظ شگفتگی استعمال کرتا تھا جس نے بعد ازاں بہت سی غلط فہمیاں پیدا کیں) کا حامل نہیں تھا۔ پھر یہ کہ مشکور حسین یاد مضمون میں اصلاحی رنگ لے آتے تھے۔ چنانچہ میں نے ادب لطیف ہی میں ایک خط لکھ کر ان کے مضمون کی تعریف کرتے ہوئے ان اسقام کی طرف بھی ہلکا سا اشارہ کر دیا۔ میں تو اپنے اس خط کو بھول چکا تھا لیکن اس کی اشاعت کے کم و بیش بیس برس بعد مشکور حسین یاد نے مجھے اس خط کا تراشہ دکھایا جو انہوں نے محفوظ کر رکھا تھا اور کہا کہ دیکھئے آپ نے ایک زمانے میں مجھے انشائیہ نگار تسلیم کیا تھا۔ یہ بات غلط نہیں تھی۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ یاد صاحب نے میرے خط کے اشاروں کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا اور بعد ازاں بتدریج اصلاحی یا انتہائی سنجیدہ فلسفیانہ انداز اختیار کرتے چلے گئے۔ حد یہ کہ انہوں نے انشائی اسلوب سے بھی نجات حاصل کر لی۔ آج وہ اپنے جن مضامین کو انشائیہ کے نام سے شائع کراتے ہیں وہ تنقیدی اسلوب میں لکھے گئے اصلاحی وضع کے مضامین ہیں جن میں انشائیہ کی تازگی کا فقدان ہے۔

مگر جن ایام کا میں ذکر کر رہا ہوں وہ محض انشائیہ لکھنے ہی کا دور نہیں تھا بلکہ انشائیہ فہمی کا دور بھی تھا۔ چنانچہ انشائیہ فہمی کے سوال پر مولانا صلاح الدین احمد نے "ادبی دنیا" میں متعدد مباحث کرائے۔ جن میں غلام جیلانی اصغر، نظیر صدیقی اور دوسرے دوستوں نے خوب حصہ لیا۔ ان میں سے نظیر صدیقی انگریزی کے استاد ہونے کے باعث انشائیہ (یعنی پرسنل ایسے) کے مقتضیات سے تو واقف تھے لیکن انشائیہ کو پہچاننے کے معاملے میں وہ بھی اختر اورینوی اور ڈاکٹر محمد حسنین وغیرہ کے گروہ ہی سے تعلق رکھتے تھے۔ چنانچہ خود انہوں نے انشائیہ کے نام سے جو مضامین لکھے وہ زیادہ سے زیادہ رشید احمد صدیقی کے تتبع میں لکھے گئے طنزیہ مزاحیہ مضامین ہی کہلا سکتے ہیں۔

۱۹۶۵ء تک انشائیہ اور انشائیہ نگاری کے سلسلے میں کچھ دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ مگر

میں کوئی ایسی تحریر موجود نہیں ہے جسے مکمل انشائیہ کا نام دیا جا سکے۔ البتہ تقسیم ملک کے بعد انگریزی کے لائٹ یا پرسنل ایسے کے تتبع میں ایسی تحریریں وجود میں آئی ہیں جو تقسیم ملک سے پہلے کے مضامین سے صنفی اعتبار سے مختلف ہیں۔ لہٰذا میں نے کہا کہ اس بات کی ضرورت ہے کہ اس نومولود کو ایک نئے نام سے موسوم کیا جائے تاکہ اذہان پر اس کی انفرادیت کا احساس مرتسم ہو سکے اور وہ اسے دوسری اصنافِ نثر سے الگ کرنے میں کامیاب ہوں۔ اپنے اس مؤقف کو عملی جامہ پہنانے کے لیے میں نے انگریزی کے پرسنل ایسے یا لائٹ ایسے کے لیے ایک متبادل اردو لفظ کی تلاش شروع کر دی تاکہ وہ غلط فہمیاں جو لفظ ایسے سے انگریزی میں پیدا ہوئی تھیں اردو میں بھی پیدا نہ ہو جائیں مگر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ ادھر ہم نے پرسنل ایسے کے لیے "انشائیہ" کا لفظ تجویز کیا اور ادھر یار لوگوں نے اس لفظ کو غیر افسانوی نثر کے لیے مختص کرنا شروع کر دیا۔ بس سارا جھگڑا یہیں سے شروع ہوا۔ مگر اس اجمال کی تفصیل ضروری ہے۔

میں نے ۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۰ء تک کے عرصہ میں 'ادبِ لطیف' میں متعدد پرسنل ایسے تحریر کئے تھے جنہیں لائٹ ایسے، انشائے لطیف، لطیف پارہ، مضمونِ لطیف وغیرہ ناموں کے تحت شائع کیا گیا تھا مگر چونکہ ایسے کے لفظ نے خود مغرب میں بہت سی غلط فہمیوں کو جنم دیا تھا جنہیں ہمارے انگریزی پڑھانے والوں نے وراثت میں حاصل کیا تھا لہٰذا میں چاہتا تھا کہ پرسنل یا لائٹ ایسے کے لیے کوئی نیا اور منفرد اردو نام تجویز کیا جائے انہی دنوں میں نے بھارت کے کسی رسالے میں "انشائیہ" کا لفظ پڑھا اور مجھے یہ لفظ اتنا اچھا لگا کہ میں نے میرزا ادیب صاحب سے جو ان دنوں "ادبِ لطیف" کے مدیر تھے، اس نام کو پرسنل ایسے کے لیے مختص کرنے کی تجویز پیش کر دی جسے انہوں نے فوراً قبول کر لیا۔ بعد ازاں مجھے معلوم ہوا کہ مجھ سے پہلے ڈاکٹر سید محمد حسنین "انشائیہ" کا لفظ لائٹ ایسے کے معنوں میں استعمال کر چکے تھے۔ مگر جن لائٹ ایسیوں کے لیے انہوں نے یہ لفظ استعمال کیا تھا وہ سرے سے لائٹ ایسے تھے ہی نہیں۔ پچھلے دنوں اس سلسلے میں مزید دو انکشافات ہوئے۔ ایک تو یہ کہ تقسیم سے

سرسری سی چنانچہ میں اور مشتاق قمر اکثر انشائیہ کے مستقبل کے بارے میں سوچتے اور کہتے کہ کم از کم ہماری زندگیوں میں تو اس صنف کے پھولنے پھلنے یا مقبول ہونے کے امکانات بہت کم ہیں۔ کیونکہ پچھلے ایک سو برس سے اُردو داں طبقہ مضمون کے لفظ سے مانوس ہو چکا ہے۔ اور مضمون میں اگر طنز و مزاح ہو تو اسے بطورِ خاص پسند کرتا ہے۔ لہٰذا۔ انشائیہ کے اس خاص وصف سے مانوس ہونا اس کے لئے بہت مشکل ہے جو معمولی شے کے غیر معمولی پن کو سطح پر لاتا ہے اور جمالیاتی حظ مہیا کرنے کے علاوہ سوچ کے لئے غذا بھی مہیا کر دیتا ہے گویا اس وقت ہمارے نزدیک انشائیہ کو مقبول بنانے کے لئے انشائیہ کو پہچاننے کی ایک باقاعدہ تحریک شروع کرنے کی ضرورت تھی۔ مگر یہ جبھی ممکن تھا کہ ایک بڑی تعداد میں اُردو انشائیے دستیاب ہو سکتے۔ اِدھر یہ حال تھا کہ ابھی انشائیوں کا صرف ایک مجموعہ ہی شائع ہوا تھا۔ مشتاق قمر اس سلسلے میں بہت سنجیدہ تھے لیکن چونکہ وہ ایک عرصہ سے طنزیہ مزاحیہ مضامین لکھتے آ رہے تھے۔ لہٰذا ان کیلئے ایک مدار سے باہر آ کر ایک بالکل نئے مدار میں گردش کرنا بے حد مشکل تھا تاہم اُنہوں نے ہمت نہ ہاری اور چار برس تک انشائیہ نگاری کی کوشش کے بعد بالآخر ایک انشائیہ لکھنے میں کامیاب ہو گئے جو میں نے اوراق میں شائع کر دیا۔ یہ گویا بارش کا پہلا قطرہ تھا۔ اس کے بعد جمیل آذر، غلام جیلانی اصغر اور ڈاکٹر انور سدید نے بھی انشائیے تحریر کرنے شروع کر دیئے مشتاق قمر نے تو اتنے انشائیے لکھ لئے کہ ان کے انشائیوں کا مجموعہ "ہم ہیں مشتاق" کے نام سے شائع بھی ہو گیا۔ مگر ابھی انشائیہ کی تحریک محض چند ادبا تک ہی محدود تھی۔ نئے لکھنے والے ابھی اس میدان میں نہیں آئے تھے۔ پھر سلیم آغا کو انشائیہ لکھنے کا خیال آیا اور جب اس کا پہلا انشائیہ "اوراق" میں چھپا تو یہ انشائیہ کے میدان میں نہ صرف نئی پود کی آمد کا اعلامیہ تھا بلکہ اس سے یکایک انشائیہ نگاری کی تحریک میں تازہ خون کی آمیزش بھی ہو گئی اور انشائیہ کا نام کالجوں اور یونیورسٹیوں کی سطح پر لیا جانے لگا۔ پنجاب یونیورسٹی کے ایف اے کے نصاب میں تو اُردو انشائیے بھی شامل کر لئے گئے اور طالب علموں نیز اساتذہ کے ہاں انشائیہ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی ایک رَو وجود میں آ گئی۔ مگر مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی کہ جہاں سینئر ادبا، انشائیہ کو اکثر و بیشتر "ایسے" کا متبادل گردانتے

تھے۔ اور اس کے دامن میں ہر قسم کی غیر افسانوی نثر کو شامل کر لیتے تھے وہاں نوجوان لکھنے والے انشائیہ کے مزاج سے آگاہ ہو رہے تھے۔ اِن کے لیے یہ آسانی تھی کہ انہیں اپنے کسی سابقہ نظریے میں ترمیم کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ جب وہ اِنشائیہ پڑھتے تو اُسے فوراً پہچان لیتے حتّٰی کہ اسے طنزیہ اور مزاحیہ یا ہلکے پُھلکے معلوماتی قسم کے مضامین سے الگ کرنے میں بھی کامیاب ہو جاتے۔ اوراق نے ان نئے انشائیہ نگاروں کے لیے اپنا دامن کُشادہ کر دیا۔ چنانچہ پہلے جہاں اوراق کے ہر شمارے میں محض دو یا تین انشائیے شائع ہوتے تھے جن کا مُشکل ہی سے کوئی نوٹس لیتا تھا وہاں اب دس بارہ اور اس کے بعد اٹھارہ بیس اِنشائیے ایک ہی شمارے میں شائع ہونے لگے اور نوجوان لکھنے والوں کے علاوہ بہت سے منجھے ہُوئے ادیب بھی انشائیہ نگاری کی طرف راغب ہو گئے۔ چُنانچہ کامل القادری، اکبر حمیدی، محمّد منشایاد، حیدر قریشی، محمّد اسد اللہ، رام لعل نابھوی، پرویز عالم، طارق جامی، جان کاشمیری، محمّد اقبال انجم، انجم نیازی، محمّد ہمایوں، سلمان بٹ، رشید گریجہ، رعنا تقی، اظہر ادیب، سعشہ خان، یُونس بٹ، امجد طفیل، تقی حسین خسرو، حامد برگی، بشیر سیفی، علی اختر، قمر اقبال، خالد اقبال، راجہ ریاض الرحمٰن، خالد صدیقی، خالد پرویز، شمیم ترمذی، نذیر احمد راہی، آفاق احمد اور راغب شکیب کے علاوہ بہت سے سینئر ادبا، مثلاً جوگندر پال، احمد جمال پاشا، غلام الثقلین نقوی، شہزاد احمد، صابر لودھی اور ارشد میر بھی اِنشائیہ نگاری کی طرف راغب ہو گئے۔ اور مجُھے یہ دیکھ کر بے حد خُوشی ہُوئی کہ وُہ اِنشائیہ کو طنزیہ مزاحیہ مضامین نیز دیگر سنجیدہ معلوماتی مضامین سے ایک بالکل الگ صنف قرار دیتے تھے اوراق میں اِنشائیہ نگاری کو فروغ ملا تو دُوسرے رسائل اور بعد ازاں اخبارات نے بھی اِنشائیہ کو اپنے مینو MENU میں شامل کر لیا حتّٰی کہ رسالہ "فنون" بھی اِنشائیہ کو اپنی فہرست میں شامل کرنے پر مجبُور ہو گیا لیکن اُسے نئے اِنشائیہ نگاروں کا تعاون حاصل نہ ہو سکا۔

اِنشائیہ کے یکایک اس قدر مقبُول ہو جانے کا نتیجہ یہ نِکلا کہ اس کے خلاف محاذ آرائی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس محاذ آرائی نے تین واضح صُورتیں اِختیار کیں پہلی تو یہ کسی ایسی شخصیت

کی تلاش کی جانے لگی۔ جسے اُردو میں اِنشائیہ نگاری کا بانی اور منتہی قرار دیا جا سکے۔ دُوسری یہ کہ اُردو اِنشائیہ کے بارے میں یہ تاثر دیا جائے کہ اِنشائیہ تقسیم کے بعد وجُود میں نہیں آیا بلکہ سرسید کے زمانے سے (بعض کے نزدیک ملا وجہی کے زمانے سے) لکھا جا رہا ہے اور اِس لیے اِنشائیہ نگاری کی جس تحریک کی آج کل پبلسٹی ہو رہی ہے وُہ صِرف پُرانی شراب ہے جو نئی بوتلوں میں پیش کی جا رہی ہے۔ تیسری یہ کہ خود صنفِ اِنشائیہ کی مذمت کی جائے۔ اِنشائیہ اور انشائیہ نگاروں کا مذاق اُڑایا جائے۔ نیز یہ تاثر عام کیا جائے کہ صنفِ انشائیہ کی کوئی جامع و مانع تعریف نہیں ہے۔ ہر قسم کی نثر پر انشائیہ کا لیبل لگ سکتا ہے۔ علاوہ ازیں اِنشائیہ خُود مغرب میں دم توڑ چکا ہے اب اُردو والے اس مُردے کو دوبارہ کیسے زندہ کر سکتے ہیں؟ پہلی صُورت کے تحت یکے بعد دیگرے کئی شخصیتوں کو آزمایا گیا ایک شخصیت کے سر پر تو تاجِ زریں بھی رکھ دیا گیا لیکن بات نہ بن سکی۔ دُوسری صُورت کا معاملہ یہ تھا کہ اگر انشائیہ کی اس تعریف کو قبُول کر لیا جاتا جو ہم لوگوں نے پیش کی تھی اور پھر اس کی روشنی میں اِنشائیہ کی پہچان کا اہتمام بھی ہو جاتا تو وُہ لاتعداد طنزیہ مزاحیہ مضامین لکھنے والے کہاں جاتے جن کی شہرت کی اساس ان کے مضامین پر استوار تھی ہم لوگوں نے ان حضرات کو بار بار یقین دلایا کہ طنزیہ مزاحیہ مضامین کا ایک اپنا مرتبہ اور توقیر اور اہمیت ہے۔ وُہ کیوں اِس بات پر مصر ہیں کہ ان کے مضامین پر ضرور ہی اِنشائیہ کا لیبل لگایا جائے مگر ان کی ایک مجبُوری تھی وہ یُوں کہ انشائیہ کے لفظ کی توقیر اب اتنی زیادہ ہو گئی تھی کہ اس کا لیبل لگائے بغیر خُود ان حضرات کا ادبی مرتبہ معرضِ خطر میں پڑ سکتا تھا دُوسری طرف ہمارے لئے مشکل یہ تھی کہ ہر قسم کی طنزیہ مزاحیہ یا سنجیدہ تحریر پر انشائیہ کا لیبل لگا کر انشائیہ کی پُوری تحریک کو دریا بُرد کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ سو ہم نے بہت سے مقتدر طنز و مزاح نگاروں کی نگارشات کو انشائیہ تسلیم کرنے سے اِنکار کر دیا۔ بلکہ جن کے تتبع میں اُنہوں نے اپنے مضامین لکھے تھے مثلاً کپور اور پطرس اور رشید احمد صدیقی اور شوکت تھانوی وغیرہ ان حضرات کے سلسلے میں بھی اِس بات کا برملا اظہار کر دیا کہ اپنے خاص میدان میں تو ان ادبا، کی اہمیت مسلّم ہے مگر انہیں کسی صُورت

بھی اِنشائیہ نگار تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

جب فریقِ مخالف نے معاملے کو بگڑتے دیکھا تو صنفِ انشائیہ کے خلاف ایک اور سطح پر محاذ آرائی شروع کر دی یعنی صنفِ انشائیہ کی مذمت کا آغاز کر دیا گیا۔ اس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے ڈاکٹر انور سدید نے اپنی معرکۃ الآرا کتاب "انشائیہ اُردو ادب میں" لکھ کر انشائیہ کی پوری تاریخ کو سمیٹ لیا اور انشائیہ کے سارے خدوخال اس شرح و بسط کے ساتھ پیش کر دیئے کہ لکھنے والوں کے نوجوان طبقے کی تربیّت ہونے لگی اور اب وہ کھُلے بندوں بعض طنزیہ مزاحیہ لکھنے والوں کے انشائیہ نگار کہلانے کے دعویٰ کو مُسترد کرنے لگے۔ چُنانچہ فریقِ مخالف کو اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ انشائیہ کو مُسترد کرنے کی کارروائی کو مزید تیز کر دیا جائے۔ چنانچہ اس سلسلے میں ایک اخباری مہم شروع کی گئی جس میں عطاالحق قاسمی اور ان کے دوستوں نے بھرپور حصہ لیا۔ اُن کا طریقِ کار یہ تھا کہ اِدھر اُدھر سے انشائیہ کے خلاف چُٹکلے اکٹھے کرتے یا خود اختراع کرتے اور پھر اخبارات میں شائع کر دیتے تھے تاکہ انشائیہ کے خلاف نفرت پیدا ہو سکے۔ چُنانچہ اس قسم کے فقرے کہ "انشائیہ پڑھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔" اور "انشائیہ ایک تیسری جنس ہے۔" ٹی ہاؤسوں اور محفلوں اور اخباروں میں لڑھکائے گئے۔ جس ادیب سے "رونگٹے کھڑے ہونے" کا واقعہ منسُوب کیا گیا تھا اس کا قصّہ یہ تھا کہ وُہ اپنی تصنیف کے علاوہ شاذ ہی کسی دُوسرے کی کتاب کا مطالعہ کرنے کا عادی تھا۔ بلکہ اگر کبھی وہ کسی کتاب کی ورق گردانی کرتا ہُوا نظر آجاتا تو خُود دیکھنے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ بہرحال انشائیہ اور انشائیہ نگاروں کی توہین کا یہ سلسلہ محض اخباروں اور ٹی ہاؤسوں تک ہی محدُود نہ رکھا گیا بلکہ ایک خاص منصُوبہ کے تحت اسے ایک کتابی شکل میں پیش کرنا بھی ضرُوری سمجھا گیا۔ اس قسم کی توہین آمیز کتاب لکھنے کا کام ڈاکٹر سلیم اختر کے سُپرد کیا گیا۔ جنہوں نے ڈاکٹر انور سدید کی کتاب کے جواب میں "انشائیہ کی بنیاد" پر ایک ایسی کتاب شائع کی جس کا ادبی معیار مشکوک اور اندازِ تحریر قابلِ اعتراض تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ پچھلے پچیس سالوں میں اِس کتاب کے علاوہ بھی انشائیہ کے بارے میں بہت سی بے پر کی اُڑائی گئی ہیں۔ مثلاً ایک یہ کہ انشائیہ ایسے معمولی اور بے مصرف موضوعات پر اظہارِ خیال کرتا ہے جن کی معاشرتی اور سیاسی حتیٰ کہ مابعد الطبیعاتی نقطۂ نظر سے بھی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ مثلاً ایک صاحب نے کہا کہ بھلا بال کٹوانا یا آئس کریم کھانا بھی کوئی موضوع ہے جس پر انشائیہ تحریر کیا جائے اور اس بات کو فراموش کر دیا کہ انشائیہ اِس دُنیا کی کسی شے کو بھی معمولی قرار نہیں دیتا۔ اِس کی نظروں میں ذرّہ بھی اتنا اہم ہے جتنی کُل کائنات۔ بیسویں صدی جس میں MICROCOSM کی لامحدودیت کا تصور عام ہو رہا ہے اور شیئت بھی محض رابطہ کی ایک صورت متصور ہونے لگی ہے، بڑے اور چھوٹے موضوعات کی تخصیص کیا معنی رکھتی ہے؟ کسی زمانے میں کہانی شہزادوں اور شہزادیوں، جنوں اور پریوں کے بارے میں لکھی جاتی تھی یا بڑی بڑی مہمات سر کرنے والوں کے بارے میں قلم کی جولانیاں دکھائی جاتی تھیں پھر جاگیردار سرمایہ دار اور پوش سوسائٹی کے کردار فکشن کا موضوع بنے۔ مگر آج کہانی اُونچے اُونچے میناروں اور محلوں سے نیچے اُتر کر بازاروں میں ننگے پاؤں چل رہی ہے۔ اور بالکل "عام" سے کرداروں اور واقعات کو اپنا موضوع بنا رہی ہے۔ یہی حال شاعری کا ہے جو کبھی مثنوی اور قصیدہ کے ذریعے معاشرے کے اُونچے طبقوں کی عکاسی کرتی تھی مگر اب عام شہری کے محسوسات کو مَس کر رہی ہے۔ ایسی صورت میں انشائیہ کا یہ کمال ہے کہ اُس نے اپنی ابتدا ہی زمین سے کی ہے اِس نے بڑے بڑے محلوں، مقتدر کرداروں، گونجتے ہوئے نظریوں اور عقیدوں اور نعروں کو اپنا موضوع بنانے کے بجائے سامنے کی اشیا مثلاً کرسی، اونگھنا، واشنگ مشین، جھوٹ، دسمبر، فُل سٹاپ، مچھلی کا شکار، طوطا پالنا، آہٹ، انتظار گاہ اور فائل ایسے موضوعات کو چھُولا ہے۔ لیکن ان بالکل معمولی موضوعات کے ایسے "غیر معمولی" پہلوؤں کو اُجاگر کیا ہے کہ معمولی چیزوں کے سامنے نام نہاد غیر معمولی چیزیں بالکل معمولی نظر آنے لگی ہیں۔ یہی نہیں! انشائیہ نے ایک اور کام یہ کیا ہے کہ وہ موضوعات اور کردار اور ادارے جنہیں معاشرے نے محض عادتاً یا احتراماً جملہ نقائص

اور استقام سے ماورا سمجھ رکھا تھا خود ان پر ایک نئے زاویے سے نظر ڈال کر ان کے معمولی پن کو اُجاگر کر دیتا ہے۔ مثلاً جب کوئی انشائیہ نگار IGNORANCE OF THE LEARNED پر انشائیہ لکھتا ہے یا کائنات کی لامحدودیت کو دل کے اندر کارفرما دیکھتا ہے یا سچ کی منافقت اور شرافت کی بزدلی اور بہادری کی حادثاتی نوعیت کو سامنے لاتا ہے تو وہ قاری کو اس نظریاتی اخلاقیاتی اور معاشرتی خول سے باہر نکالتا ہے جس میں اُس نے خود کو محبوس کر رکھا تھا اس اعتبار سے دیکھئے تو انشائیہ اکڑی ہوئی گردنوں اور انانیت میں مبتلا لوگوں کو جھنجھوڑنے اور انہیں بیدار کرنے کا نام ہے۔ اس قسم کی صنفِ نثر کو جو انسان کے باطن کو اُجلا کرنے، اسے جگانے اور معمولات کی میکانکی تکرار سے اسے نجات دلانے کے لئے کوشاں ہو، اس بات پر مجبور کرنا کہ وہ سیاسی یا نظریاتی یا معاشی سطح کے اخباری موضوعات کو "عصری آگہی" کے نام پر حرزِ جان بنائے بالکل ایسے ہی ہے جیسے گھر کے صحن میں ایک چھوٹا سا گڑھا کھودنے کے لئے ایٹم بم چلا دیا جائے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ اہلِ نظر ابھی تک انشائیہ کی بے پناہ قوت سے واقف نہیں ہو سکے۔ انہیں شاید معلوم نہیں کہ جس طرح ایک مجدد معاشرے کی تجدید کرتا ہے۔ اسی طرح جب انشائیہ کسی ادب میں نمودار ہوتا ہے تو پورے ادب کی تجدید ہو جاتی ہے ابھی سے اردو انشائیہ نے اردو افسانہ اور نظم اور سفرنامے پر اپنے اثرات مرتسم کرنے شروع کر دیئے ہیں۔ بلکہ اہم بات یہ ہے کہ اس نے نئی پود کو آنکھیں میچ کر لکیر کا فقیر بنے رہنے کے نقصانات سے بھی آگاہ کیا ہے۔ اور بنے بنائے نظریات اور رویوں پر نظرِ ثانی کی ضرورت کا احساس دلایا ہے۔ انشائیہ ایک نئے زاویۂ نگاہ کا نام ہے۔ زندگی کو دوسرے کنارے سے دیکھنے کی ایک روش ہے۔ انشائیہ ایک مثبت طرز کی "بغاوت" ہے جو شخصیت پر چڑھے ہوئے زنگ کو اتارتی ہے تشنج کو رفع کرتی ہے اور انسان کو جذباتی اور نظریاتی جکڑ بندیوں سے نجات دلا کر آزادہ روی کی روش پر گامزن کر دیتی ہے ایسی دلآویز، امکانات کی حامل اور لطافت سے مملو صنفِ نثر کو پیش پا افتادہ اخباری موضوعات پر خامہ فرسائی کی دعوت دینا ایک قومی المیہ نہیں تو اور کیا ہے!

انشائیہ پر ایک اور اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ تبسم زیرِ لب کا اہتمام کرتا ہے لیکن کھُل کر قہقہہ لگانے کی اجازت نہیں دیتا اور یُوں انسانی مسرت کے راستے میں رکاوٹ بن جاتا ہے اس کا نہایت عمدہ جواب مُشتاق قمر نے یہ کہہ کر دیا ہے کہ آپ کس قسم کی مُسرت کے جویا ہیں ؟ کیا ایسی مسرت کے جو لطیفے سُن کر ایک بھرپُور قہقہہ لگانے کے بعد غبارے کی طرح پھٹ جاتی ہے یا ایسی مُسرت کے جو آپ کے دِل کے اندر موم بتّی کی طرح سُلگتی ہے اور تا دیر سلگتی رہتی ہے دونوں میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ طنز یا مزاح سے پیدا ہونے والا قہقہہ فاضل اسٹیم کے اخراج کا اہتمام کرتا ہے۔ چُنانچہ قہقہہ لگانے کے بعد انسان کی حالت اس کارتُوس کی سی ہو جاتی ہے جس میں سے چھرّے نکل چُکے ہوں اس کے بعد اس کے لئے ارد گرد کے ماحول کو بے معنی نظروں سے دیکھنے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں رہ جاتا یا پھر وہ عادی نشہ باز کی طرح مزید لطائف کی فرمائش کرتا ہے تاکہ مزید جمع شُدہ اسٹیم کا اخراج کر سکے اس کے برعکس انشائیہ کا مقصد ہنسی کو تحریک دینا نہیں۔ اس کا مقصد ذہن کو تازہ دم کرنا ہے اس کے لئے وہ بقدرِ ضرورت تبسم زیرِ لب کا اہتمام کرتا ہے یا ایسے تبسّم کا جسے شاعرانہ مزاح POETIC HUMOUR کہا گیا ہے اور جو غالب کی شاعری کے علاوہ مُشکل ہی سے کسی دُوسرے اُردو شاعر کے ہاں نظر آتا ہے۔ یہ مزاح کی وہ قسم ہے جس میں آنسو اور تبسم ایک دُوسرے میں جذب ہو جاتے ہیں مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ تبسم زیرِ لب کسی لطیفے کو سُن کر برانگیخت نہیں ہوتا بلکہ معنی کی پرتوں کے اُترنے پر مُتحرک ہوتا ہے چُنانچہ جب انشائیہ نگار ایک معمُولی سی شے میں مضمر معنی کو سطح پر لاتا ہے اور پھر یکے بعد دیگرے اس کے پرت اُتار کر نئے نئے مفاہیم کو اُجاگر کرتا ہے تو قاری ایک نئی معنویت کا (بعض اوقات بے معنویت کی معنویت کا) عرفان حاصل کر کے ایک انوکھی مُسکراہٹ سے بہرہ ور ہوتا ہے۔ یہ مُسکراہٹ اصلاً ایک عارفانہ مُسکراہٹ ہے جو سدھیارتھ کے ہونٹوں پر اس وقت نمُودار ہوتی ہے جب اس پر اچانک کائنات کا راز فاش ہو جاتا ہے اور مونالیزا کے ہونٹوں پر اس وقت جب اسے اپنی تخلیقی حیثیت کا عرفان حاصل ہوتا ہے سو انشائیہ نگار

کو معنی خیز تبسم عطا کرنے کے اہم کام سے روک کر محض فقرہ بازوں اور لطیفہ گویوں کی صنف میں لا کھڑا کرنا کفرانِ نعمت نہیں تو اور کیا ہے ؟

اِنشائیہ پر ایک یہ پھبتی بھی کسی گئی ہے کہ وہ انشائیہ نگار کو جھک کر ٹانگوں میں سے سمندر کو دیکھنے کا مشورہ دیتا ہے پس منظر اس پھبتی کا یہ ہے کہ میں نے اِنشائیہ فہمی کے سِلسلے میں ابتداً جو مضامین تحریر کیے ان میں اس بات پر زور دیا تھا کہ اِنشائیہ سامنے کی چیزوں یا مناظر کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے کا نام ہے اس کے لِئے یا وہ چیزوں اور مناظر کو اُلٹ پلٹ کر دیکھتا ہے تاکہ ان کے چُھپے ہُوئے پہلُو نظر کے سامنے آجائیں یا پھر خُود اپنی جگہ سے ہٹ کر ان چیزوں اور مناظر کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے کی کوشش کرتا ہے ۔ موخرالذکر بات کو میں نے کئی مثالوں سے واضح کرنے کی کوشش کی جن میں ایک مثال تو بچپن کے اس تجربے سے لی جب لڑکے بالے کھیل کُود کے دوران جُھک کر ٹانگوں میں سے منظر کو دیکھتے ہیں اور یُوں انہیں ہر روز کا دیکھا بھالا منظر بالکل انوکھا نظر آنے لگتا ہے ۔ میں نے دُوسری مثال دریا کے کنارے کے سِلسلے میں دی اور کہا کہ اگر آپ دریا کے ایک کنارے سے دُوسرے کنارے کو دیکھنے کے عادی ہیں اور آپ کو ہر روز ایک ہی اکتا دینے والا منظر نظر آتا ہے تو آپ کسی روز دُوسرے کنارے پر چلے جائیں اور وہاں سے پہلے کنارے کو دیکھیں تو آپ کو سارا منظر ایک بالکل نئے رُوپ میں نظر آئے گا ۔ لہٰذا اِنشائیہ "دوسرے کنارے" سے دیکھنے کا نام ہے ۔ مُراد یہ کہ ہم عادت اور تکرار کے دائرے سے باہر آئیں شخصیت کی آہنی گرفت سے آزاد ہوں اور خُود پر سے معاشرتی دباؤ کو ہٹائیں تو ہمیں ہر شے ایک نئے تناظر میں نظر آئے گی اور اس کے چُھپے ہُوئے مفاہیم اُبھر کر سامنے آجائیں گے یہ عمل ہمیں سوچ کی غذا مہیا کرے گا ۔ اور ہمارے اندر کی اس "حیرت" کو جگائے گا جس کے بغیر ادب کی تخلیق ممکن نہیں ہے ہم میں سے اکثر لوگ اعصابی تناؤ کا شکار ہیں جو معاشرتی ، نظریاتی اور اخلاقی دباؤ کا نتیجہ ہے اور انسان کو ایک تنگ دائرے میں مقید رکھتا ہے انشائیہ نگار جب اِنشائیہ لکھتا ہے تو خُود بھی اعصابی تناؤ سے آزاد ہوتا ہے اور اپنے قاری کو بھی "آزاد" ہونے کی راہ دکھاتا ہے ۔ آزادہ روی ، کا یہ عمل انشائیہ کا محرک بھی

ہے اور اس کا ثمر شیریں بھی۔ وہ لوگ جو بھاری بھرکم لبادوں میں ملبوس ہیں، جنہوں نے خود کو معاشرتی اور اخلاقیاتی پابندیوں میں کچھ زیادہ ہی محبوس کر رکھا ہے وہ نہ تو انشائیہ لکھنے پر ہی قادر ہو سکتے ہیں اور نہ اُنہیں انشائیہ سے لُطف اندوز ہونے کی سعادت حاصل ہو سکتی ہے ایسے لوگ جو ہمہ وقت اپنی دستار کو سنبھالنے کے شُبھ کام پر مامور ہیں اِن کے لِئے جھک کر ٹانگوں سے منظر دیکھنا یا درخت پر چڑھ کر اس پر ایک نظر ڈالنا یا پھر ہر روز کے دیکھے بھالے کنارے کو چھوڑ کر دُوسرے کنارے پر جا نکلنا ناقابلِ برداشت ہے وجہ یہ کہ وہ آزاد نہیں ہیں۔ وہ دراصل اس اعصابی خوف میں مُبتلا ہیں کہ زمانہ اُنہیں دیکھ رہا ہے اگر اُنہوں نے بنی بنائی کھائیوں سے باہر آنے کی کوشش کی تو زمانہ اُن کا مذاق اُڑائے گا یا اُنہیں سزا دے گا۔ لہٰذا وہ جسمانی و ذہنی دونوں سطح پر ساری زندگی لکیر کے فقیر بن کر گزار دیتے ہیں۔ اِنشائیہ اس قسم کے زنگ آلود معاشرے پر سے زنگ کو کھرچنے کا نام ہے جس کے نتیجے میں لوگوں کو اپنے معمولات سے اُوپر اُٹھنے کی تحریک ملتی ہے اور عادت اور تکرار کے زندان سے باہر آنے کا موقع عطا ہوتا ہے۔

آخر میں میں محض ایک اور بات کا ذکر کروں گا وہ یہ کہ اِنشائیہ ایک ایسی غیر افسانوی صنفِ نثر ہے جو قاری کو بیک وقت فکری لُطف اندوزی، جسمانی تسکین اور جمالیاتی حظ مہیا کرنے پر قادر ہے۔ لہٰذا میں اسے ایک امتزاجی صنف قرار دیتا ہُوں جس میں کہانی کا مزہ، شعر کی لطافت اور سفرنامے کا تحرک یکجا ہو گئے ہیں۔ تاہم انشائیہ محض ان اوصاف کی "حاصل جمع" کا نام نہیں وہ ان سب کو اپنے اندر جذب کر کے خود ایک ایسی اکائی بن کر نمودار ہوتا ہے۔ جس کی انفرادیت ان جملہ اوصاف کی حاصل جمع سے "کچھ زیادہ" ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے انشائیہ کا ایک اپنا سٹرکچر ہے جو سٹرکچرنگ STRUCTURING کے عمل کو بروئے کار لا کر سدا نئے نئے امکانات کی طرف پیش قدمی کرتا ہے۔

بیسویں صدی میں دیگر اصنافِ ادب پر فنونِ لطیفہ کی یلغار صاف محسوس ہو رہی ہے مثلاً شاعری پر موسیقی کی اور کہانی پر فلم کی۔ لیکن اِنشائیہ وُہ واحد صنف ہے جو اپنی انفرادیت

کو برقرار رکھنے ہُوئے ہے۔ اس میں اختصار کا دامن وسیع ہے اور خُود اس کے اندر امکانات کا یہ عالم ہے کہ اُسے کسی اور فن لطیف کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ مُجھے اس بات کا کامل یقین ہے کہ اِنشائیہ وُہ واحد صنفِ نثر ہے جو آنے والی صدیوں میں اپنے وجُود کو برقرار رکھنے میں پوری طرح کامیاب ہو گی اور اپنی ہیئت اور مواد دونوں میں ایجاز و اختصار کو ملحوظ رکھنے کے باعث ان تیز رفتار صدیوں کے قدموں سے قدم مِلا کر چل سکے گی۔ اپنے ایک انشائیہ GOING ON A JOURNEY میں ہیزلٹ نے ایک جگہ لکھا ہے!

Give me a clear blue sky over my head., a green turf beneath my feet., a winding Road before me and three hour's march to dinner and then to thinking.

دیکھا جائے تو یہی اِنشائیہ نگار کا اصل منصب بھی ہے۔ کیونکہ وہ شاہراہ سے اپنے لئے ایک پگڈنڈی نکالتا ہے پھر اس پر اکیلا مصروفِ سفر ہو کر زمین کی سبزی اور آسمان کی نیلاہٹ کے عین درمیان جمالیاتی حظ کی تحصیل کا اہتمام کرتا ہے۔ پھر رات کے کھانے سے لُطف اندوز ہوتا ہے اور کھانے کے بعد وہ سوچ کے اُس لامتناہی سِلسلے سے متعارف ہوتا ہے جو ازل اور ابد کے درمیان ایک سُنہری زنجیر کی طرح پھیلا ہُوا ہے لہٰذا اِنشائیہ نگار بیک وقت ایک فن کار بھی ہے، دُنیادار بھی اور صُوفی یا مفکّر بھی!۔ وہ پگڈنڈی پر سفر کرتے ہُوئے جمالیاتی حظ حاصل کرتا ہے تو ساتھ ہی رات کے کھانے سے لُطف اندوز ہونے کو بھی ضروری سمجھتا ہے۔ مگر کھانے کے بعد لطیفہ گوئی میں وقت صرف کرنے کے بجائے سوچ کی تازگی میں جذب ہو جاتا ہے۔ گویا وہ بیک وقت جمالیاتی تسکین AESTHETIC SATISFACTION بھی حاصِل کرتا ہے، جسمانی لذّت PHYSICAL SATISFACTION بھی اور ذہنی یا عارفانہ تسکین یعنی SPIRITUAL SATISFACTION بھی اگر کوئی صِنف انسان کو بیک وقت ان تینوں سطحوں پر مسرّت مہیا کرنے پر قادر ہو تو اس سے بڑی صنفِ ادب اور کون سی ہو سکتی ہے؟

مہمانِ خصوصی کا خطاب

—— ڈاکٹر وحید قریشی

فارسی اور اُس کے بعد اُردو ادب میں اِنشائی ادب کی تلاش و جستجو اور اس موضوع سے میری دلچسپی خاصی پُرانی ہے۔ وُہ اس طرح کہ فارسی زبان و ادب میں پی ایچ ڈی کے لِئے جو موضُوع میرے لِئے تجویز ہُوا وہ فارسی کے اِنشائی ادب سے متعلق تھا۔ اس موضُوع پر کام کرنے کے بعد میں نے اُردو اِنشائیوں کا ایک انتخاب " اُردو کا بہترین انشائی ادب " کے عنوان سے تیار کیا اور اس پر ایک مفصّل دیباچہ بھی لکھا۔ گو اِنشائی تحریروں کا مطالعہ اب تک جاری ہے لیکن مندرجہ بالا موضوعات و کتب کی بنا پر انشائیے سے اپنا تعلق بہت پُرانا سمجھتا ہُوں۔

انشائی ادب اور اس ضمن میں ہونے والے مباحث کی بنا پر جو اہم ترین اور بُنیادی باتیں میرے ذہن میں ہیں میں اُن کے بارے میں اظہارِ خیال کرنا چاہتا ہُوں۔ ایک بات تو یہ ہے کہ یہ صنفِ ادب اپنی ہیئت کے اعتبار سے ہمیشہ سیّال رہی ہے۔ ابتدا سے لے کر اب تک اس صنف کو اس کے ابتدائی رجحانات، اسالیب اور ردِّ عمل کے حوالے سے متعیّن کیا جاتا رہا ہے جس کی بنا پر اس کی کوئی خارجی تکنیک اب تک معرضِ وجُود میں نہیں آسکی۔ اُردو میں ہمیں اِنشائی ادب کے جو نمُونے مِلتے ہیں ان کا آغاز اُس جذباتی ردِّ عمل سے ہوتا ہے۔

رجس میں ہمارے ادیبوں نے ایک آزاد ترنگ کے طور پر اس کا اظہار کیا چنانچہ انشائے ابوالفضل کا تیسرا دفتر یعنی تیسرا حصّہ بھی اسی طرح کی آزاد ترنگ کو پیش کرتا ہے۔

خُود انشاء کا لفظ شرُوع شرُوع میں یعنی ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری کے بعد ڈرافٹنگ کی اصطلاح کی حیثیت رکھتا تھا جسے آپ آج کل کی اصطلاح میں رَف ڈرافٹنگ کہہ سکتے ہیں۔ اوّل اوّل انشائیے کی اصطلاح دارالانشاء یعنی سرکاری دفاتر کے اس شعبے میں استعمال کی گئی جہاں خطُوط اور احکام و فرامین لکھے جاتے تھے۔ اس طرح دیکھا جائے تو اس لفظ سے ہماری وابستگی بہت پُرانی رہی ہے۔ اسی لیے اُردو اور فارسی میں آزاد ترنگ کی حامل تحریریں کو انشائیے کی بجائے "انشائی ادب" کہا گیا۔ اس کے مقابلے میں انشائیہ جسے ہم آج کل لائٹ ایسّے کے معنوں میں استعمال کر رہے ہیں۔ بیسویں صدی کی چیز ہے اور ہمارے ہاں مغرب سے آئی ہے۔ اور یہ بھی آزاد ترنگ ہے لیکن اس کی شکل وشباہت یورپ اور انگلستان میں ترقّی پانے کے بعد اُردو میں آئی ہے اور مغربی ادب سے اثرات قبُول کرتے ہُوئے اُردو میں اسے بیسویں صدی ہی میں اپنایا۔ اس صُورتِ حال کا نتیجہ یہ ہے کہ انشائیہ نگاروں اور انشائی ادب لکھنے والوں نے جب بھی انشائیہ لکھا تو اس میں نفسِ مضمُون اور لہجوں کے اعتبار سے اُس کلاسیکی روایت کو سامنے رکھا جو فارسی سے اُردو میں آئی۔ چُنانچہ آپ کو انشائی ادب کے جو نمُونے ملتے ہیں وہ سارے کے سارے فارسی سانچے میں ہیں یعنی جو بھی موضُوعات اختیار کیے جاتے ہیں اُن میں آزادی رویّہ کارفرما رہتا ہے اور یہ رویّہ بھی بنیادی طور پر جذباتی رویّہ ہوتا ہے۔

اس کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے کہ وُہ تحریریں جنھیں ہم آج کل اصطلاحاً انشائیے کے دائرے میں شامل کرتے ہیں اُس کا مُوجد یا بانی کون ہے۔؟ میرے خیال میں یہ ایک بنیادی سوال نہیں بلکہ ضمنی سوال ہے کیونکہ کسی بھی میدان میں کسی شخص کی محض اولیت سے بات نہیں بنتی۔ ابھی آپ کے سامنے بعض احباب نے اس کا ذکر کیا کہ لائٹ ایسّے کے طور پر اُردو میں لفظ انشائیہ کب سے استعمال ہونے لگا؟ - جیسا کہ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ بیسویں صدی اس کا نقطہ آغاز

ہے اور اس میں بھی یہ لفظ ۳۵-۱۹۳۰ء کے قریب مستعمل ہُوا۔ اس دَور میں بعض تحریریں اور بعض نمونے ایسے ملتے ہیں جنھیں اِنشائیہ قرار دیا گیا لیکن یہ تو محض لفظوں کی بات ہے اصل چیز یہ ہے۔ کہ یہ صنفِ ادب جو موجُودہ شکل میں لکھی جارہی ہے مغرب سے آئی ہے۔ دُوسری طرف اِس نے قدیم ادب سے استفادہ کیا ہے۔ اِس طرح اِنشائی ادب میں گنگا جمنی کیفیت صُورت پذیر ہُوئی۔

جہاں تک اِنشائیے کی تکنیک کا تعلق ہے اس ضمن میں یہ عرض کرنا شاید بے موقع نہیں ہو گا کہ اِنشائیہ تکنیک کے اعتبار سے مختلف ہیئتوں میں لکھا جاتا رہا ہے۔ کبھی تو اس کا ایک سرا افسانے سے جا ملتا ہے اور کبھی دُوسرا سرا مزاحیہ مضمُون سے مربُوط ہو جاتا ہے۔ علی الھذا القیاس یہی کیفیت دُوسری اصنافِ ادب کے بارے میں ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس کی خارجی ہیئت معرضِ وجُود میں نہیں آسکی۔ لہٰذا ہم اِنشائیے کو دُوسری اِصناف سے محض اس کی داخلی رُوح کی وجہ سے ممیّز کرتے ہیں۔ مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ انشائیہ کسی ایک فارمٹ کا پابند نہیں ہُوا جب کہ وزیر آغا نے صرف ایک یا دو فارمٹس کو اختیار کیا ہے لیکن یہ کوئی اعتراض کی بات نہیں۔ جس طرح آپ کسی افسانہ نگار یا ناول نویس سے ہمیشہ کسی ایک مخصُوص سانچے کا تقاضہ نہیں کرتے اسی طرح ہر انشائیہ نگار کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وُہ چاہے تو اپنے انشائیوں میں مزاحیہ رنگ کو جگہ دے اور چاہے تو کوئی اور سانچہ اِختیار کرے۔ اس ضمن میں آپ اُس پر کوئی قدغن نہیں لگا سکتے کیونکہ ادب کو کسی سکندری گز سے نہیں ناپا جا سکتا۔

شکریہ

صدارتی خطبہ

جناب ڈاکٹر ذوالفقار علی
وائس چانسلر۔ اسلامیہ یونیورسٹی

مہمانانِ گرامی! میں آپ سب حضرات کو بہاول پور بطورِ خاص یونیورسٹی کے پروگرام میں تشریف لانے پر صدق دل سے خوش آمدید کہتا ہوں اور آپ کا شکر گزار ہوں خصوصاً جناب ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کا کہ وہ اپنی علالت اور بے شمار مصروفیات کے باوجود "انشائیہ سیمینار" کے لئے وقت نکال سکے اور ہمیں اپنے گرانقدر ارشادات سے مستفید فرمایا۔ میں اور میرے رفقاء اس کرم فرمائی کے لئے بے حد ممنون ہوں۔

حضراتِ گرامی! یہ یونیورسٹی ایک نئی یونیورسٹی ہے لیکن نئی ہونے کے ساتھ ساتھ قدیم بھی ہے۔ کیونکہ یہ ایک قدیم دینی و اسلامی درسگاہ جامعہ عباسیہ کی ترقی یافتہ صورت ہے۔ جامعہ عباسیہ کی بنیاد ۱۹۲۵ء میں رکھی گئی تھی اور یہ جامعہ، جامعہ اسلامیہ کی صورت میں جلوہ گر ہوئی اور ازاں بعد ۱۹۷۵ء میں یہی جامعہ ایک مکمل یونیورسٹی کی صورت میں نمودار ہوئی۔ اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور نوعمر ہونے کے باوجود جامعہ عباسیہ کی علمی و ادبی اور تحقیقی روایات کی وارث اور امین ہے اور ہم ہر ممکن کوشش کرتے ہیں کہ ان روشن اور عظیم روایات کی پاسبانی کی جائے۔ چنانچہ ہر برس جامعہ میں علمی موضوعات پر مذاکروں اور سیمینارز کا انعقاد ضروری سمجھا جاتا ہے۔ اسی سال ہم نے سیرت النبیؐ

پر ایک سہ روزہ سیمینار کا اِنعقاد کیا تھا۔ پہلے دن مختلف مکاتیب فکر سے تعلق رکھنے والے جید علماکرام نے تقاریر کی تھیں ۔ دُوسرے دن مقالات کی نشست کا اہتمام کیا گیا تھا اور تیسرے دن نعتیہ مشاعرہ منعقد ہُوا جس میں مُلک کے نامور و معروف شعراء نے شرکت کی۔

شعبہ اُردو و اقبالیات اِسلامیہ یُونیورسٹی بہاول پُور کے زیرِ انصرام منعقد ہونے والا انشائیہ سیمینار بھی اِسی سِلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اِس سِلسلے میں مَیں ڈاکٹر شفیق احمد صاحب اور ڈین فیکلٹی آف آرٹس ڈاکٹر مصباح العین صاحب کو مُبارک باد پیش کرتا ہُوں کہ اِن کی اَن تھک محنت اور اور کاوش کی بنا پر اِس اجتماع کا اِنعقاد ممکن ہو سکا۔

حضراتِ گرامی! میں عربی زبان و ادب اور علوم اسلامیہ کا طالبِ علم ہُوں اور باوجُود اِس کے کہ میرا اورنٹیل کالج لاہور سے بڑا گہرا تعلق رہا ہے اور باوجُود اِس کے کہ مجھے ڈاکٹر سیّد عبداللہ مرحُوم سے تلمذ اور ڈاکٹر وحید قریشی سے مصاحبت کی نسبت ہے، میں اُردو زبان و ادبیات کے ساتھ کوئی گہرا علمی رابطہ اور تعلق پیدا نہ کر سکا۔ بنابریں اِنشائیہ ایسے ٹھوس اور ٹیکنیکل موضوع پر میرے لیے کوئی نئی بات کہنا شاید ممکن نہ ہو۔ تاہم ایک عامی یعنی Layman کی حیثیت سے موضوعِ زیرِ بحث سے متعلق چند گزارشات پیش کرنے کی جسارت کروں گا۔

اقوام و ملل کی طرح اصنافِ شعر و ادب بھی عصری حالات و تقاضوں کے مُطابق جنم لیتی، پروان چڑھتی اور عروج کے مراحل طے کرنے کے بعد اپنے منطقی انجام کو پہنچ کر ختم ہو جاتی ہیں۔ مثلاً ایک زمانے میں ہمارے ادب میں داستانوں کا دَور دَورہ تھا لیکن موجُودہ دَور داستان کا عہد نہیں ہے۔ اِس زمانے میں کسی کے پاس اتنا وقت ہی نہیں کہ وُہ "الف و لیک لیلۃ" اور "داستانِ امیر حمزہ" کا مطالعہ کر سکے خواہ ان سے کیسی ہی ذہنی بالیدگی حاصل ہونے کے مواقع کیوں نہ ہوں اور شاید اسی لِئے آج کا ادیب داستان نہیں لِکھتا۔ جن عصری حالات نے داستانوں کو آؤٹ آف ڈیٹ کیا ہے۔ اِنہی حالات کے باعث اُردو ادب میں ناول، افسانہ اور بعد ازاں اِنشائیہ کی جدید صنفِ ادب پیدا ہُوتی۔ اگر میرے اِس جُملے سے اُردو انشائیے کے ناقدین و محققین میں سے کچھ حضرات کی دل آزاری

کا سامان ہُوا تو میں ابتدا ہی میں معذرت کر لیتا ہُوں۔ اِس لئے کہ اُردو میں انشائیہ کی ابتداء اور ارتقاء کی حقیقی کیفیت کے بارے میں کچھ کہنا میرا منصب نہیں۔ البتہ میں اِس قدر ضرور عرض کروں گا کہ اگر انشائیہ کی جُملہ خصُوصیات پر نظر رکھی جائے تو یہ خصُوصیات ہمیں الگ الگ بہت قدیم زمانے سے ملنے لگتی ہیں۔ ان کے کچھ نمُونے اُردو کی قدیم داستانوں میں بھی ہیں۔ غالب کے مکتُوبات میں بھی اور سر سیّد، خواجہ حسن نظامی، ابوالکلام آزاد، پطرس بُخاری، رشید صدّیقی اور فرحت اللہ بیگ کے مضامین وغیرہ میں بھی۔ لیکن انشائیے کی تمام خصُوصیّات پہلی بار صرف ہمارے ہی دَور میں مجتمع ہُوئیں اور اِن خصُوصیات کی حامل تحریروں نے اِنشائیے کا نام پایا۔ در اصل میں اُردو ادب میں اِنشائیے کی قدامت یا جدیدیت کو زیرِ بحث لائے بغیر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جس طرح صنفِ شعر بیشتر نثری و شعری اصناف کی بیشتر خصُوصیات کا احاطہ کئے ہُوئے ہے بالکل اِسی طرح اُردو انشائیہ بھی بیشتر شعری و نثری اصنافِ ادب کی خصُوصیات کا مجمُوعہ ہے۔ مثلاً اِس میں کہانی بھی ہو سکتی ہے اور ڈرامائی سچوئیشن بھی۔ اِس میں تاریخ کو بھی موضُوع بنایا جا سکتا ہے اور کسی فرد کی انفرادی حیات و سوانح کو بھی۔ اِس میں کسی کی مدح و ستائش بھی کی جا سکتی ہے اور ذم بھی۔ اِنشائیے میں کسی بتِ طناز کے حسنِ بلاخیز کے قصیدے بھی پڑھے جا سکتے ہیں اور قومی و معاشرتی مسائل و معاملات پر بھی اظہارِ خیال کیا جا سکتا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ دو خاص وجُوہ کی بنا پر انشائیہ، مرثیے پر بھی گوئے سبقت لے جاتا نظر آتا ہے۔ مثلاً یہ کہ مرثیے کے موضُوعات بظاہر محدُود ہیں۔ یعنی واقعاتِ کربلا اور اِس کے متعلقات کا بیان۔ جب کہ اِنشائیے کے دامن میں دُنیا بھر کے موضوعات سما سکتے ہیں۔ اِس کے علاوہ مرثیہ اپنے موضُوع کی سنجیدگی کے اعتبار سے کسی بھی طور طنز و مزاح کا متحمل نہیں ہو سکتا جب کہ انشائیے میں خیال انگیز سنجیدگی کے ساتھ ساتھ ہمیں خُوش فکری اور طنز و مزاح کے پہلو بھی نظر آتے ہیں۔ بعض حضرات کہہ سکتے ہیں کہ مرثیہ اخلاقی تعلیم و تربیت کا ذریعہ بنتا ہے جب کہ بظاہر انشائیہ اِس خُوبی سے تہی دامن ہے۔ یہ بات کسی حد تک دُرست بھی لگتی ہے۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو معلُوم ہو گا کہ مرثیہ میں اخلاقی تعلیم و اصلاح کا جو پہلو بالکل

عُریاں اور نُمایاں ہوتا ہے ، وُہ اِنشائیہ میں آکر بے شمار پردوں میں چُھپ جاتا ہے۔ اور غالباً اِسی لیے باقاعدہ پند و نصائح کے مقابلے میں اس طرح اس کی تاثیر بھی بڑھ جاتی ہے۔

اِس اعتبار سے مَیں بلا خوفِ تردید کہہ سکتا ہُوں کہ ہمارے آج کے اُردو ادب میں انشائیہ ایک جامع ترین صنفِ ادب ہے۔ اور یہی بات اِس کی مقبولیّت کا بُنیادی سبب اور اِس کے محفُوظ و تابناک مستقبل کی بدیہی ضمانت ہے۔ لیکن میں اِنشائیے کے ناقدین کی توجہ جس امر کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہُوں وہ دِل خراش حقیقت یہ ہے کہ صنفِ اِنشائیہ کی ایسی جامعیت کے باوجُود آج تک اِس کی کوئی جامع و مانع تعریف متعیّن نہیں کی جاسکی جس کی وجہ سے مختلف دبستانوں کے ناقدین کے درمیان ہونے والے قلمی مباحث ، مباحثوں کی حدُود سے اکثر تجاوز کر جاتے ہیں۔

نہ صرف یہ بلکہ بعض اوقات ایسی صوُرت بھی دیکھنے میں آتی ہے کہ کچُھ ادیب اپنے اِنشائیہ نگار ہونے کا اِعلان کرتے ہیں لیکن ناقدین اُنھیں اِنشائیہ نگار نہیں مانتے بعض اوقات ناقدین حضرات جن تحریروں کو بہ تکرار انشائیہ قرار دیتے ہیں۔ ان تحریروں کے خالق اِس سے اِنکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم اِنشائیہ نگار نہیں۔ جب کہ بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ نہ تو مصنّف نے اپنے بارے میں اِنشائیہ نگار ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور نہ ہی ناقدین نے اِن تحریروں کو اِنشائیہ قرار دیا ہے لیکن عام قاری کا جی چاہتا ہے کہ وُہ ان تحریروں کو اِنشائیہ ہی قرار دے۔

اگر معاملہ یہی ہوتا تو بھی خیریت ہوتی لیکن مُشکل یہ ہے کہ اکثر اوقات ایک ہی نقّاد کی تنقید پڑھتے ہُوئے اِنشائیہ کے بارے میں متضاد و متصادم خیالات و آراء سے سابقہ پڑتا ہے۔ یعنی اِس ضمن میں اِنشائیہ کی کیفیت بقول شاعر کچُھ یُوں ہے کہ۔

ع جنابِ شیخ کا نقشِ قدم یُوں بھی ہے اور وُوں بھی

اپنے فرائض منصبی کے اعتبار سے مجُھے مختلف یُونیورسٹیوں کے سلیکشن بورڈز میں شرکت کا موقع ملتا رہتا ہے۔ ایسے مواقع پر مَیں اکثر دیکھتا ہُوں کہ اچھے خاصے امیدوار انٹرویو کے دوران میں اِنشائیہ پر ہونے والے سوالات سُن کر بغلیں جھانکنے لگتے ہیں بطورِ خاص اُس

وقت جب انھیں اِنشائیہ کی جامع و مانع تعریف کرنے کو کہا جاتے۔ ظاہر ہے کہ نسبتاً جدید صنفِ ادب کے بارے میں یہ صورتِ حال قابلِ رشک نہیں کہی جاسکتی۔

گو ہمارے بعض ناقدین نے اس طرح کی کوششیں کی ہیں مثلاً۔ اس ضمن میں "ادبی دُنیا" "اوراق" اور "فنون" کے علاوہ دیگر ادبی مجلّوں میں ہونے والے مباحث تو قابلِ قدر ہیں ہی لیکن اب تو اِنشائیہ اور انشائیہ نگاروں پر باقاعدہ کُتب بھی ملنے لگی ہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس سب کے باوجود اس طرف زیادہ سنجیدگی سے توجّہ کرنے کی ضرورت ہے۔ جہاں تک اِنشائیہ لکھنے کے رجحان کا تعلّق ہے تو اس ضمن میں بلاخوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے ادیبوں نے اس پہلو سے خاطر خواہ کام کیا ہے بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ ہمارے ادیبوں نے غزل کے بعد سب سے زیادہ توجّہ اِسی صنفِ ادب پر دی ہے اور اس سلسلے میں نئے اور پُرانے ادبا میں ایک دو نہیں بلکہ بہت سے نام ایسے ہیں جو آئندہ چل کر اُردو اِنشائیہ کی بدولت شہرت حاصل کریں گے۔ دُوسری طرف اِن ادیبوں کی شبانہ روز کاوشوں کے نتیجے میں اِنشائیہ بھی ایک معتبر صنفِ ادب کی حیثیت سے سامنے آتے گا۔

جہاں تک صنفِ انشائیہ کے ضمن میں اِسلامیہ یُونیورسٹی کی کارکردگی کا تعلّق ہے تو میں بصدِ افتخار یہ اِعلان کرتا ہُوں کہ یُونیورسٹی ہٰذا کے شعبۂ اُردو کے تدریسی نصاب میں اس صنف کا مطالعہ ایک عرصہ سے شامل ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ امسال شعبۂ اُردو کی ایک طالبہ نے ڈاکٹر روشن آرا، راؤ صاحبہ کی رہنمائی میں ڈاکٹر وزیر آغا کی اِنشائیہ نگاری پر ایک تحقیقی و تنقیدی مقالہ سپردِ قلم کیا ہے۔ جب کہ اِنشائیہ سمینار کی صُورت میں ہماری سعی آپ کے سامنے ہے۔ یہاں پر میں ایک امر کی وضاحت ضروری سمجھتا ہُوں کہ اس سمینار میں آپ کو اُردو اِنشائیہ کے ضمن میں بعض معروف نام نظر نہیں آرہے۔ اِس کا سبب یہ نہیں ہے کہ اِن سے رابطہ نہیں کیا گیا بلکہ یہ ہے کہ ان حضرات کی تشریف آوری میں ان کی مصروفیات و مشاغل مزاحم ہُوتے۔ ورنہ ہم نے تو ایک درجن سے زیادہ اہلِ علم حضرات سے درخواست کی تھی کہ وہ تشریف

لائیں اور اپنے خیالات سے نوازیں۔ بہر حال

آئندہ و گزشتہ تمنّا و حسرت است
یک کاشکے بود کہ بصد جا نوشتہ ایم

مَیں آخر میں اپنے جُملہ مہمانانِ گرامی اور حاضرین مجلس کا شکریہ ادا کرتا ہُوں۔

دُوسرا حصّہ

انشائیہ

ٹیلیفُون

—— محمّد سلیم ملک

"ٹیلی" کہتے ہیں دُور کو اور "فوُن" کا مطلب ہوتا ہے آواز یعنی دُور کی آواز۔ گویا اُردو کے محاورے میں ٹیلیفوُن کو دُور کے ڈھول کہہ سکتے ہیں۔ جو ہمیشہ سہانے ہی ہوتے ہیں لیکن فی زمانہ ہر شے کا مفہوم بدلتا بلکہ اُلٹتا جا رہا ہے۔ اِس لئے ٹیلیفوُن بھی اب سہانا ڈھول نہیں رہا۔ ایک زمانہ تھا جب یہ ایجاد اکسیر جاں تھی مگر اب تو وبال جان بن گئی ہے۔ جس سے طرح طرح کی زحمتیں آئے دن پیش آتی رہتی ہیں۔ جب یہ ایجاد نئی نئی آئی تھی تو لوگ عش عش کر اُٹھتے تھے کہ "واہ بھئی واہ" کمال ہے۔ کس طرح یہ شیطانی آلہ کان سے لگاؤ تو پرے پرے تک کی بات کان میں آپڑتی ہے اور اِس کے اندر جو کچھ بولو میلوں دُور بیٹھا دُوسرا شخص جھٹ سُن لیتا ہے آلہ نہ ہُوا الہ دین کا چراغ ہو گیا۔ دُنیا جہان کی باتیں معلوم کر لو۔ گویا کہ یہ جامِ جمشید ہُوا یا پھر الف لیلیٰ کا جادو" مگر اب ٹیلی فوُن کی یہ وی آئی پی حیثیت باقی نہیں رہی۔ اب یہ ہر جگہ دال روٹی کی طرح کثرت سے استعمال ہوتا ہے۔ یہاں وہاں بولا اور سُنا جاتا ہے۔ زید بکر اس میں تو تکار کرتے پھرتے ہیں۔ آلہ نہ ہُوا غریب کی جورو ہو گیا جو سب کی بھابھی ہوتی ہے۔
بعض لوگ ٹیلی فوُن کو وقت گزاری کا ذریعہ بنا لیتے ہیں وُہ ٹیلیفوُن ڈائرکٹری میں

سے چُن چُن کر نمبر نکالتے اور پھر ان پر قسمت آزمائی کرتے رہتے ہیں۔ کہیں سے جھاڑ پڑی، کہیں سے پھٹکار، کہیں سے گرجدار مردانہ آواز سُنائی دی تو کہیں سے آئندہ فون کرنے کے خطرناک نتائج سے آگاہ کیا گیا۔ مگر یہ منچلے اپنے پائے ثبات میں لغزش نہیں آنے دیتے اور ان کا دماغ اور فون کا ڈائل گھومتا ہی رہتا ہے اور ان کا رسیور ہے کہ کریڈل پر ٹکتا ہی نہیں۔

ٹیلی فون استعمال کرنے والوں کا ایک طبقہ گھریلو مستورات کا ہوتا ہے کہ میاں کو کام پر روانہ کر، جھاڑو دے، آلو گوشت کی ہانڈی چولہے پر چڑھا، چارپائیاں کھڑی کر اور مُنّے کو سلا کر فون کے قریب آن بیٹھتی ہیں اور پھر دُور اور قریب کی سہیلیوں، عزیزوں، رشتہ داروں اور نیم رشتہ داروں سے باتیں کرنے لگتی ہیں۔ دُنیا جہان کے موضوع پناہ مانگنے لگتے ہیں۔ امریکہ کی پالیسیوں سے انجمن کی شادی تک مُلکی صورتِ حال سے موسمی کپڑوں تک اور ٹی۔وی ڈرامے سے مُنّے کی کھانسی تک کے سارے موضوعات ایک ایک کرکے ادھیڑے جاتے ہیں۔ وہ تو آپ نے سُنا ہوگا کہ کسی خاتون کو ٹیلیفون پر طول کلامی کی بڑی عادت تھی۔ مسلسل دو دو گھنٹے تک بات کرنا ان کا معمول تھا۔ ایک بار شوہر نے ذرا جُرأت سے کام لے کر اتنی طویل بات کرنے سے منع کیا۔ تو خاتون نے اگلا فون بیس منٹ بات کرکے رکھ دیا۔ شوہر نے فتح مندی سے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے میری نصیحت تُم پر اثر کر گئی ہے۔" تو بیوی نے جواب دیا "نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں اصل میں یہ رانگ نمبر تھا۔"

ٹیلیفون سے استفادہ کرنے والا ایک طبقہ دفتر کے مُلازموں کا ہوتا ہے۔ انہیں دفتر میں گھر کے بہت سے کام نمٹانے پڑتے ہیں۔ وقت کم ہوتا ہے اور ذاتی کاموں کی فہرست لمبی ہوتی ہے ناچار وُہ ملازم فون کا سہارا لیتے ہیں۔ اور دفتر آتے ہی وہ پرچہ سامنے رکھ لیتے ہیں جو دفتر آتے وقت نیک بخت نے ہاتھ میں تھما دیا تھا اور پھر ذاتی فون کرنے کی مصروفیت شروع ہو جاتی ہے یہاں وہاں گھنٹیاں بج رہی ہیں۔ دُور اور نزدیک کے شہروں سے بات ہو رہی ہے سُخن سازی کا یہ سلسلہ زمان و مکان کی قید سے بے نیازانہ جاری ہے۔ یہ صدقہ جاریہ بعض اوقات اتنا طویل

ہو جاتا ہے کہ دفتر میں اخبار پڑھنے، چائے پینے اور دوستوں سے گپ شپ کرنے کا بھی وقت نہیں ملتا۔ رہا دفتر کا منصبی کام تو وہ تو چلتا ہی رہتا ہے۔ کارِ سرکار کس تمام نہ کرد۔

کچھ لوگ بزدلی کی اس منزل پر ہوتے ہیں جو فون پر دھمکیاں دیا کرتے ہیں۔ انہیں سامنے آنے کی یا تو جرأت ہی نہیں ہوتی یا پھر وہ شاید سامنے آ کر شرما جاتے ہیں۔ اس لیے ٹیلیفون کے ذریعے اپنا حالِ دل بیان کرتے اور اپنی عزت بچاتے پھرتے ہیں۔ جب کہ بعض لوگ ٹیلیفون کے ذریعے ہوائیاں اڑاتے ہیں۔ شوشے چھوڑتے ہیں اور افواہیں پھیلاتے ہیں۔ لوگوں کو خوفزدہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسے اپنا ایڈونچر قرار دیتے ہیں اور خلقِ خدا کو ہراساں کر کے دانت نکالتے پھرتے ہیں کہ انہوں نے بڑا تیر مارا ہے لیکن انہیں خبر نہیں ہوتی کہ ان کے اکثر ٹیلیفون صدا بند ہو جاتے ہیں۔ ان کے فون کے نمبر کا پتہ چل جاتا ہے۔ فون کرنے والے کی بھی نشاندہی ہو جاتی ہے۔ تب لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں۔ عوام کی حفاظت کے ادارے جب ان کی تفتیش کرتے ہیں تو یہ اپنی ساری چوکڑی بھول جاتے ہیں اور پھر معافیاں مانگتے اور گریہ و زاری کرتے پھرتے ہیں۔

ٹیلی فون پر باتیں کرنے والوں کا ایک شوقین طبقہ ایسا بھی ہے۔ جس کے پاس اپنا فون میسر نہیں ہوتا۔ اس لیے وہ ہمیشہ اس تاک میں رہتے ہیں کہ کہیں فون ذرا اکیلا مل جائے تو اس بے زبان پر کراٹے کا ایسا ہاتھ مارتے ہیں کہ کراچی، پشاور کی خبر لاتے ہیں۔ ایسے ناگہانی حملوں سے بچنے کے لیے لوگوں نے یہ کیا ہے کہ ٹیلیفون کی بولنے والی سائڈ کا مقناطیس نکال لیتے ہیں لیکن یہ شکاری لوگ سننے والی سائڈ سے سنتے اور پھر اسی سائڈ سے ہی بول لیتے ہیں۔ یا پھر خود کفالت کے طور پر مقناطیس اپنی جیب میں رکھتے ہیں۔ جہاں ٹیلیفون کا لوہا دیکھا اپنا مقناطیس لگا لیا اور شب خون مارنے میں کامیاب ہو گئے اور کچھ لوگ تو فون کے نمبروں کے حساب سے اپنی انگلی سے ٹک ٹک ٹک کر کے اسے چھیڑتے ہیں اور دو چار رانگ نمبروں کی دشت نوردی کے بعد بالآخر مطلوبہ نمبر پکڑنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ان کی مہارت اور چابکدستی کی بھی داد دینا پڑتی ہے اگر اس سے آدھی محنت بھی وہ کر لیں تو ٹائپ کرنا سیکھ جائیں مگر شاید ان کی طبیعت ادھر

نہیں آتی۔

ٹیلیفون کالوں کی ایک قسم سفارشی ٹیلیفون کی ہوتی ہے۔ اس کی خوبیاں بے شمار ہیں۔ اور خرابی ایک بھی نہیں۔ کیونکہ سفارشی بات لکھ کر کسی کو بھیجی جائے تو وہ پکڑی جا سکتی ہے۔ وہ رقعہ ہو، درخواست پر مصلحت آمیز جملہ ہو یا ملاقاتی کارڈ پر دستخط ہوں یہ سب قابلِ گرفت ہیں۔ کیونکہ ان کا کاغذی پیراہن اپنا ایک دستاویزی ثبوت رکھتا ہے۔ مگر فونی سفارش الحمدللہ وہ بے سر و پا بات ہے جس کی کوئی شہادت نہیں۔ اس کا کوئی نقش باقی نہیں رہتا۔ بات ایک کے منہ سے نکلتی ہے اور دوسرے کے سینے میں اتر جاتی ہے۔ پہلا اپنا منہ پونچھ لیتا ہے اور دوسرا اپنا سینہ ڈھانک لیتا ہے۔ پھر سفارشی فون میں آواز کی گرج چمک اور لہجے کی نرمی و گرمی بھی سامع کے کانوں میں پگھلا سیسہ ڈال کر سفارشی کام کو منزل سے ہمکنار کر دیتی ہے۔

ایک زمانہ تھا جب ہمارے ہاں نیا نیا ٹیلیفون آیا تھا تو خدا جھوٹ نہ بلوائے فون کرنے سے پہلے فون کرنے کا اہتمام کیا کرتے تھے۔ پہلے مسواک کیا کرتے۔ پھر نہا دھو کر اجلے کپڑے پہنتے اور خوشبو لگا کر فون کے پاس آ بیٹھتے تھے۔ پنسل کان میں اڑس کر یہ لمبا کاغذ سامنے پھیلا دیتے اور خوشی و خوف کے ملے جلے جذبات سے چونگا اٹھاتے تھے اور پھر سنوار کر اور نتھار نتھار کر اردو بولا کرتے تھے۔ مگر اب تو یہ وقت آ گیا ہے کہ نہ مسواک کرتے ہیں اور نہ منہ ہاتھ دھوتے ہیں۔ سر جھاڑ منہ پھاڑ دھوتی باندھے آتے ہیں اور ٹیلیفون پر باتیں کرنے لگ جاتے ہیں۔ کھانستے جاتے ہیں اور بولتے جاتے ہیں۔ اور ذرا نہیں سوچتے کہ کھانسی کے جراثیم سننے والے کے کان میں پڑ رہے ہوں گے۔

انشائیہ

بچّے اور اسکُول

تحریر۔ محمّد سلیم ملک

سچ پُوچھیے تو مُجھے آج کل کا یہ نیا فیشن ایک آنکھ نہیں بھاتا جس کی رَو میں بہہ کر لوگ کہتے پھرتے ہیں کہ بچے ہمارا مستقبل ہیں، ہمارے بڑھاپے کی لاٹھی ہیں۔ آخری عُمر کا سہارا ہیں خُوشحال لوگوں کی دیکھا دیکھی اَب تو غریبوں نے بھی یہی راگ الاپنا شُروع کر دیا ہے۔ اِس لیے وہ بچّوں کی ایک فوج ظفر موج تیّار کر لیتے ہیں کہ ان میں سے کوئی لاٹھی تو سہارا دے ہی دے گی۔ کوئی تیا تو ترپ کا پتّا ثابت ہو ہی جائے گا۔ اِن بے شمار کھوٹے سکّوں میں سے کوئی سکّہ تو چل ہی جائے گا۔ لیکن وہ یہ بھُول جاتے ہیں کہ بچّوں کی اِس فصل کو پک کر تیار ہونے کے لئے ایک عرصہ درکار ہوتا ہے۔ ان رنگ برنگے بچوں کو بار آور کرنے کے لِئے ضروری ہے کہ وہ پہلے کسی اسکُول کا مُنہ دیکھیں۔ اِس کے لِئے بہار کے موسم میں جب درختوں کی شاخوں پر نئے پھُول کھِلتے ہیں، والد صاحب گرامی اپنے اُوپر تلے چار بچّوں کو اسکُول داخل کرانے اس شان سے روانہ ہوتے ہیں کہ کوئی کندھے پر بیٹھا رہے سہے بال کھینچ رہا ہے۔ کوئی بازوؤں میں جھُولتا جا رہا ہے۔ کوئی ٹانگوں سے لپٹ لپٹ جاتا ہے تو کوئی شریفانہ انداز میں محض ہاتھ کھینچ کھینچ کر اپنے وجُود کا احساس دلاتا ہے اِس طرح یہ بچے پکّے پھل کی طرح شاخوں سے جھُولتے ہُوئے مدرسے پہنچتے

ہیں۔ نہ میرٹ کا کھڑاگ، نہ فیس کا ٹنٹا۔ اِس لئے کہ ان بچّوں نے کون سا اسکول پر بوجھ بننا ہے جہاں سینگ سمائیں گے بیٹھ جایا کریں گے۔ زمین پر لوٹ لگا کر سبق یاد کر لیا کریں گے۔ برہنہ پا اور خاک بسر رہنے سے طبیعت میں عجب طرح کی بے نیازی اور انکساری پیدا ہوتی ہے۔ ویسے بھی دانہ خاک میں مل کر گُل و گلزار ہوتا ہے۔ مگر جن بچوں کو جان و دل عزیز ہوتا ہے وہ چٹائی یا بوریا اپنے ہمراہ لاتے ہیں اور اسکول کی زمین کتنی سخت اور سنگلاخ کیوں نہ ہو اس پر بچھا کر غزل کہہ لیتے ہیں۔

اِن تعلیمی شفاخانوں کی، معاف کیجئے سرکاری اسکولوں کی، غیر سرکاری حالت زار سے یار لوگوں نے خُوب فائدہ اُٹھایا ہے اور خود رو گھاس کی طرح یہاں وہاں پرائیویٹ اسکولوں کا ایک جال سا بُن دیا ہے۔ فیض کے یہ چشمے ہر طرف جاری ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ واحد کاروبار ہے جس کے انتظام کے لیے پڑھے لکھے ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ بات استثنائی حالتوں میں غلط بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن بہر حال مطابقت کی صُورت میں بندہ ذمہ دار نہیں ہے۔ اس منفعت اندیش کاروبار کے لئے کچھ سرمایہ اور تھوڑی سی ہوشیاری کافی ہے۔ بگڑا ہُوا انگریزی نام رکھیں، اپنے نومولود کا نہیں، نوزائیدہ اسکول کا۔ ایک بینر، دو پوسٹر اور تین ہینڈ بل اس کے علاوہ ہوں۔ تو گویا شہد کا چھتّہ تیار ہے۔ والدین کی مجال نہیں کہ وہ اس چھتّے سے اُڑ کر کہیں اور جا سکیں۔ داخلے کی رقم اور ماہوار فیس جتنی زیادہ ہوگی۔ والدین اِسی قدر جوش و خروش سے آئیں گے کہ ضرور اس اسکول کا معیار تعلیم بہت بلند ہوگا اور یہ جو بعض ناسمجھ والدین اسکولوں کی بڑھی ہُوئی فیس کا رونا روتے ہیں وُہ بہت غلط کہتے ہیں۔ کوئی ان سے پُوچھے وہ اپنے بچّوں کو اسکول بھیجتے ہی کیوں ہیں جس کا سر موم کا بنا ہُوا ہے۔ وُہ دُھوپ میں نکلتا ہی کیوں ہے؟

فی زمانہ بچّوں کو اچھے اسکولوں میں داخلہ دلانا بچّوں کا کھیل نہیں رہا۔ اس کے لئے عقل عیار کے ساتھ ساتھ زرِ کثیر کی ضرورت پڑتی ہے اور بہت سے دُوسرے مقامات آہ و فغاں سے گزرنا پڑتا ہے۔ جس طرح والدین نے بچّوں کو مہنگے اسکولوں میں بھرتی کرانا شانِ امارت اور سٹیٹس سمبل سمجھ رکھا ہے۔ اسی طرح اِدھر اسکول والوں نے بھی داخلے کے قواعد کو پیچیدہ اور طولانی بنا کر

والدین کی اشتہا اور بڑھا دی ہے۔ انگریزی میں چھپے فارم، تصویروں والے پراسپکٹس اور ضابطوں کے طولانی پند نامے والدین کو مبہوت کئے دیتے ہیں اس پر مستزاد یہ کہ چار سال چار ماہ چار دن پر رسم بسم اللہ کرتے ہی بچے کو داخل کرانے جائیں تو اسکول والے معذرت کر دیتے ہیں کہ آپ ایک سال لیٹ ہو گئے ہیں۔ ہم تو زیرو نرسری میں تین سال کا بچہ لیتے ہیں یعنی شیر مادر سے تازہ جدا شدہ بچہ، جس نے دنیا کا گرم و سرد ابھی تک نہ چکھا ہو۔

چشم فلک نے کچھ اسکول ایسے بھی دیکھے ہیں جو بچے کے پیدا ہوتے ہی اس کا نام اسکول میں رجسٹرڈ کرانے کا تقاضا کرتے ہیں یعنی بچے کا ماموں جب کمیٹی میں پیدائش کا اندراج کرانے جائے تو واپسی پر اسکول میں بھی اس کا نام لکھواتا آئے۔ اس طرح تو وہ دن دور نہیں جب شادی میں بھی اسکول والوں کو بر سر اقتدار پارٹی کی حیثیت سے بلانا پڑے گا اور جس طرح دوسرے رشتہ داروں کو اس موقع پر کپڑوں کے جوڑے دیئے جاتے ہیں۔ اسی طرح ایک جاپانی جوڑا مدرسے والوں کو بھی نذر کرنا پڑے گا۔ کیا خبر کل کلاں وہ نکاح کے چھوہاروں اور منگنی کے لڈوؤں میں بھی چھینا جھپٹی کرتے نظر آئیں۔ بلکہ اس سے پیشتر ابتدائی پیغام رسانی کے حساس مرحلوں میں بھی ان کی تائید و رضامندی ضروری سمجھی جانے لگے۔

کچھ اسکولوں نے والدین کو روپے پیسے سے سُبک سار کرنے کے کئی مہذب طریقے اپنا رکھے ہیں، مثلاً اس کا خود ساختہ پرنسپل آپ سے یوں ہم کلام ہوتا ہے۔ "جناب! آپ کا بچہ ہمارے اسکول میں داخل ہو جائے گا۔ لیکن یہ فرمائیں کہ آپ ہمارے اسکول کی امداد کتنی کریں گے۔ دس ہزار؟ بیس ہزار؟ اس سے زیادہ رقم دینے پر کوئی پابندی نہیں۔ اصل میں یہ انوسٹمنٹ ہے جو آپ بچے پر کریں گے۔ آپ کا بچہ ہمارے کارخانے سے ایک نفع بخش روبوٹ بن کر نکلے گا۔ ہاں تو فرمایئے کتنا (DONATION) دے سکتے ہیں آپ"۔ کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟ اس وقت اہل مدرسہ ہمارا گلا گھونٹ کر رقم کے لئے ہل من مزید کی صدا بلند کرتے ہیں۔ بچے بے چارے پکڑے جاتے ہیں بزرگوں کے کئے پر ناحق کی فریاد کرتے ہیں اور زرخیز والدین کی حیثیت سے اپنے بچوں کی کثیر تعداد سے عاجز آکر ادھر،
ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیمان کہ بس!

انشائیہ

خوئے سوال

ـــــ عابد صدّیق

اپنی حاجت کا سوال اپنے جیسے دُوسرے اِنسانوں سے کرنا عُرفِ عام میں گدائی کہلاتا ہے۔ اور جب دُوسرے اِنسانوں سے اپنی اغراض پُوری کرنا کسی شخص کو مرغوب ہو جائے تو وہ ان معنوں میں فنکار بن جاتا ہے کہ لوگوں کے جذبات میں ایسی تحریک پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جس سے اُس کا مقصُود حاصل ہو۔ یعنی اُن میں خُدا ترسی، اِنسانی ہمدردی و ایثار کی اعلیٰ صفات پیدا کرتا ہے۔ تزکیۂ نفس کا یہ پہلو گدائی میں تصوّف کی چاشنی پیدا کر دیتا ہے۔ لیکن ان میں ایسے فنکار بھی ہوتے ہیں جو فن برائے فن کے نمائندے ہوتے ہیں۔ چُنانچہ غالبؔ کہتا ہے۔

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ　　تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

بظاہر یہاں تماشا کے مقابلے میں گدائی کی حیثیت ثانوی نظر آتی ہے۔ لیکن غالبؔ چُونکہ "ظہُوری" کے مقابلے میں "خفائی" ہے اِس لئے کہتا کچھ ہے، مُراد کچھ لیتا ہے۔ ورنہ اُس کے خلوُصِ گدائی کا تو یہ عالم ہے کہ وہ اِسی پاسپورٹ کے ذریعے عشق کی سرحدوں میں داخل ہو جاتا ہے اور کہتا ہے۔

چھوڑی اسدؔ نہ ہم نے گدائی میں دل لگی
سائل ہوئے تو عاشقِ اہلِ کرم ہوئے!

لیکن گدائی کے اس رومانوی انداز میں وُہ بات کہاں جو کلاسیک کے بلند مرتبے پر عملاً فائز پیشہ ور مانگنے والوں کا طرۂ امتیاز ہے اور جو حافظ شیرازی کی "خاک نشینی" اور "مخروش" قسم کی بزدلی سے بھرپور اخلاقیات کو پیشے کا عیب سمجھتے ہیں۔ اُن کا نالہ اگر پابندِ نے ہو جائے تو اوریجنلٹی (ORIGINALITY) کا سارا مزا جاتا ہے۔

چوک پر کھڑے ہو کر صدا لگانے والے اور گلی گلی گھوم کر "سلوک" طے کرنے والے فقیروں کی تعداد اگرچہ زیادہ ہے لیکن وہ فنکاروں سے زیادہ اہلِ حرفت میں شمار کئے جانے کے لائق ہیں۔ (شریف آدمی ہمیشہ تھوڑے ہوتے ہیں) البتہ "دیدار کی گدائی والے اس سے مستثنیٰ ہیں۔

مجھے ان لوگوں پر تعجب ہوتا ہے جو گدائی کو عام پیشوں کی طرح ایک پیشہ سمجھتے ہیں۔ ہائے غلطی ہائے مضامین۔ حالانکہ گدائی یا خُوئے سوال ایک جبلت ہے جو ہر قسم کے پیشوں میں اس طرح پائی جاتی ہے جیسے ہر قسم کے پھُولوں میں رنگ۔ اور ظاہر ہے کہ رنگ کو وہ ماہر نباتات بھی پھُول کا "پیشہ" قرار نہیں دے سکتے جن کی چھٹی حس سائنس کہلاتی ہے —— یہ تو فطرت کے مبدار فیاض سے ملنے والا ایک ملکہ ہے۔ چنانچہ فطرت کی انہی فیاضیوں کی ایک شکل یہ ہے کہ دفتروں میں پائے جانے والے بابو ہوں یا ہوٹلوں میں پائے جانے والے دانشور۔ سب گدائی کی نعمت سے بہرہ ور ہیں۔ اور ان میں کوئی بھی محروم نہیں (تلوک چند تخلص کی مجبُوری کی وجہ سے مستثنیٰ ہے) بلکہ یہ گنگا تو گھر گھر بہتی ہے۔ یعنی خواتین کا مرغوب فن بھی یہی ہے۔

اس اجمال کی اگر تفصیل کی جائے تو الف نافیہ معلوم ہونے لگتا ہے۔ لیکن ذرا تصوف سے کام لیا جائے تو نفی سے اثبات کی تراوش شروع ہو جاتی ہے (گویا بہار کا اثبات ہر رنگ میں ہوتا ہے) دفتر کے معاملے میں جہاں "گاؤ خورد" قسم کی باتوں سے ایک حلال جانور کو بدنام کرنے کی کوشش کی جاتی ہے وہاں فن لُغت اور محاورہ کی غلطی بھی ہے کہ گائے اور دفتر کے اہل کار۔ جانداروں کی الگ الگ انواع ہیں۔ لیکن دفتر سے متعلق معمُولی اختیار رکھنے والا ملازم بھی کلرک ہو یا افسر۔ اگر یہ

چاہتا ہے کہ شیو کے بلیڈ بھی اتفاقی مصارف (CONTINGENCY) کی مد سے مل سکیں تو قوانین کے عین مطابق ہے کہ آخر عزمِ کار کی نیت سے چہرے پر ہاتھ پھیرنے کا موقع دفتر ہی میں میسر آتا ہے اور جن محکموں میں انٹرٹینمنٹ الاؤنس (ENTERTAINMEANT ALLOWANCE) کی سہولت حاصل ہے۔ وہاں اسی مد سے دوپہر کا کھانا چلتے رہنے میں تو کسی مضائقے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کہ "اوّل خویش" کا اصول انہی دفتری درویشوں کے لئے وضع کیا گیا ہے۔

گدائی کے اِن سرکاری مواقع میں ٹی اے، ڈی، اے کو زبردست اہمیت حاصل ہے۔ کہ اس سے زندگی کو ایک سفر اور دُنیا کو مسافر خانہ سمجھنے کی خالص اسلامی اور متصوفانہ تعلیمات پر عمل پیرا ہونے میں مدد ملتی ہے۔ "سوکھا راشن" قسم کی اصطلاحیں جدید تصوّف میں توشۂ آخرت وغیرہ کے لئے بطورِ استعارہ استعمال ہوتی ہیں۔

ہوٹلوں اور چائے خانوں کو آباد رکھنے کی "قومی ذمہ داری" ادیب، دانشور اور صحافی جس لگن اور استقلال سے سرانجام دیتے ہیں۔ اس کا اندازہ صرف اسی بات سے کیا جا سکتا ہے کہ بغیر جرئے شیر کے صبح کا شام کر دینا ان کے معمولات میں سے ہے۔ اور اس میں وہ اگر جونیئر ادیبوں، ادب کے عام پرستاروں اور ادب نواز دولت مندوں سے پان سگریٹ چائے وغیرہ پیتے رہتے ہیں تو اسے اُن کا وظیفۂ منصبی سمجھنا چاہیئے۔ اور اگر بے تکلفی سے اپنے پسندیدہ ماکولات و مشروبات کی فرمائش کر دینا در اصل ان کے اخلاقِ کریمانہ کا ایک جزو ہے۔ کہ اس سے اُن کے پرستاروں اور شناساؤں کو سرور و سرخوشی کی اُس کیفیت کا تجربہ ہوتا ہے۔ جس کا نامکمل اظہار "شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم" قسم کے مصرعوں میں ملتا ہے۔ قومی خدمت اور نوجوان نسل کی ذہنی اور ثقافتی تربیت کے اس مقدّس عمل کو گدائی سے تعبیر کرنے کے لئے بے ذوق ہونے کے ساتھ ساتھ بے درد ہونا بھی ضروری ہے۔

اب رہیں خواتین۔ تو یہ کہنا تحصیل حاصل ہے کہ اُنہیں کسی بھی معاشرے کے بُنیادی یُونٹ یعنی خاندان کی اقتصادیات میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل ہے۔ جس کی حفاظت کے لئے وہ

اکثر پُوری لمبائی میں اُسے زِپ (zip) سے ڈھانپ رکھتی ہیں۔ یہ بات چنداں اہم نہیں کہ اس کے لئے مِلتے ہُوئے رنگ کے دھاگے کی نلکی اور مشین ہمیشہ ہمسائی کی استعمال ہوتی ہے۔ مُنّے کی نِکر کیلئے الاسٹک اور بے بی کی فراک کے لئے لیس کے ٹکڑوں اور اُس پر ٹاپائیاں لگانے کے لئے رنگدار کپڑوں کی کترنوں کے سلسلہ میں اُن کی گرم جُستجو طبیعتیں ہمیشہ اُس سہیلی یا ہمسائی کے گھر کی طرف اُن کی رہنمائی کرتی ہیں جہاں سے یہ چیزیں اُنہیں خیر سگالی کے جذبات کے تحت بآسانی مِل سکتی ہوں۔

اِس کے عِلاوہ آٹے کے لئے نمک اور بعض اوقات نمک کے لئے آٹا ـــ اور مہمان آنے کی صُورت میں چینی اور چائے کی پتّی یا دُودھ کا ایک پیالہ سہ پہر میں اکثر ہمسایوں سے مُلاقات کی تقریب پیدا کر دیتا ہے۔ اسی طرح پیاز کی ایک گنٹھی، یا مرچوں کا ایک چمچہ اگر نہ مانگا جائے تو غیبت کا مزا اور عیب افشانی کا چٹ پٹا پن ختم ہو جائے۔ جس سے گھر کی خارجہ پالیسی کے اس طرح متاثر ہونے کا اندیشہ ہے کہ باہمی دلچسپی کے اُمُور پر تبادلہ خیال کی سیاسی اصطلاح کے بے معنی ہو کر رہ جانے کا امکان ہے۔

چُنانچہ گھر سے دفتر تک اور دفتر سے فکر و فن اور ادب و صحافت کی سطح مرتفع تک جو چیز مسلسل جاری و ساری ہو اُسے بِھیک کہنا صریح زیادتی اور قومی مزاج سے ناآشنائی کی دلیل ہے۔ البتہ بین الاقوامی سطح پر اسے اقتصادی تعاون کہنا معقُول بات ہے ـــ اور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ سوال کرنے سے علم اور عقل میں اضافہ ہوتا ہے!۔

انشائیہ

دُکاندار

ـــــــ عابد صدیق

خدا بھلا کرے پُرانے اہلِ حکمت و دانش کا کہ ہر موقعہ و محل کے لئے ایسے ایسے عُمدہ محاورے کہاوتیں، جامع کلمات اور اقوالِ زرّیں کا ذخیرہ چھوڑ گئے ہیں کہ بس سُنیئے اور سر دھنئے۔ وُہ تو خُدا کا شُکر کیجیئے کہ کسی دکاندار کو اس ذخیرے کا پتہ نہیں چل سکا ورنہ ہم آپ جیسے لوگ راشن کارڈ بدست، قطار میں کھڑے ہوتے۔ اپنے حصّے کی حکمت وصُول کرنے کے لئے اپنی باری کا اِنتظار کر رہے ہوتے ـــــ لیکن کبھی کبھی یہ گمان گزرتا ہے کہ شاید یہ حادثۂ فاجعہ بھی ہو چکا ہے۔ کیونکہ یونیورسٹیوں اور کالجوں میں داخلے کے لئے اپنا اپنا رزلٹ کارڈ لئے نوجوانوں کا قطار در قطار ہجوم کرنا۔ حکمت کی تلاش ہی کی قبیل سے ہے۔ جس سے یہ نتیجہ بآسانی نکالا جاسکتا ہے کہ ع کوئی معشوق ہے اِس پردۂ زنگاری میں یعنی ہمارے نظامِ تعلیم کی تاریخ میں کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی دکاندار یا تاجر کا ذہن ضرور کارفرما رہا ہے۔

بہر حال بات ہو رہی تھی حکما کے اقوال کی۔ کسی حکیم کا قول ہے کہ حیوان محض وہ ہے جو صرف حواس یا جبلتوں سے کام لیتا ہے۔ حواس اور دماغ دونوں سے کام لینے والا دانش ور ہے۔ اور وہ جو صرف ہاتھ سے کام لے مزدور ہے ـــ جو ہاتھ اور دماغ دونوں سے کام لے وہ صاحبِ ہُنر یا سائنسدان ہے۔ جو ہاتھ اور دماغ کے ساتھ ساتھ دل سے بھی کام لے وہ فنکار ہے ـــ اور

وہ شخص جو ہاتھ، دماغ، دِل اور رُوح سے بیک وقت کام لیتا ہے وہ دکاندار ہے۔

دیکھا آپ نے؟ دکاندار کا مرتبہ کس قدر بلند ہے۔ وہ ہاتھ سے کام لیتا ہے تو ہری آپ کی جیبیں خالی کر کے نوٹ گنتا ہے۔ دماغ سے کام لے کر اُن میں اضافہ کرتا ہے۔ دِل سے یُوں کام لیتا ہے کہ ہمدردی اور ایثار قسم کے نُقصان دہ جذبوں کو دِل میں نقب لگانے کی اجازت نہیں دیتا۔ اور رُوح سے کیسے کام لیتا ہے؟ یہ خُدا ہی بہتر جانتا ہے کیُونکہ رُوح کے بارے میں خُدا نے تفتیش سے منع کرتے ہُوئے فرمایا ہے کہ بس یہ اللہ کے امر سے ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جس شخص کے ساتھ اللہ کا امر ہو کوئی اس کا کیا بگاڑ سکتا ہے۔؟ چُنانچہ حکُومت اور عوام دونوں اُس کے آگے بے بس ہیں۔

دیکھنے میں آیا ہے کہ جب اِنسان کسی معاملے میں بے بس ہو جاتا ہے تو وُہ پیروں، فقیروں، ساحروں کاہنوں، رمالوں، جوتشیوں اور منجموں اور ستارہ شناسوں کی طرف رجُوع کرتا ہے۔ لیکن ستارہ شناس بھی اُس کے آگے بے بس ہیں کہ ان کا علم جن برجوں اور ستاروں تک محدُود ہے دکاندار کی ہمہ گیر شخصیت اُن سب کا احاطہ کیئے ہُوئے ہے۔ اِس سِلسلے میں غور کرنے سے جو بات ذہن میں آتی ہے وُہ یہ ہے کہ ہو نہ ہو اُس کا ستارہ شہاب ثاقب ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے ابھی ملاء اعلیٰ میں تنخواہوں کے سکیلوں پر غور و فکر اور نظرِ ثانی کے محض ارادے ہی کا ظہور ہوتا ہے کہ دکاندار اپنی زبردست قوتِ مدرکہ بلکہ کہانت سے آنے والی اقتصادی فضا کا نقشہ لے اُڑتا ہے۔ اور فوراً اس کے مُطابق قیمتوں پر نظر ثانی یا نرخوں میں اضافہ کر دیتا ہے۔ آپ کمشن بٹھاتے رہیئے وُہ اپنی بے مثال ذہانت اور پیش بینی سے کام لے کر پیش بندی کر چُکا ہے۔

مَیں نے ابھی اُس کی زبردست قوّتِ مدرکہ کو کہانت کہا تھا۔ لیکن یہ لفظ شاید اُس کی رُوحانی قوتوں کو پُورے طور پر ظاہر کرنے سے قاصر ہے۔ جس خُوبی و صحت کے ساتھ آنے والے حالات کا اندازہ یہ شخص لگا سکتا ہے، مرتاض راہب اور صُوفیاء و اولیاء بھی نہیں لگا سکتے ہو سکتا

ہے کہ یہاں یہ خیال ہمیں گمراہ کرنے کے لئے آجاتے کہ صوفیاء و اولیائے کے تو مشہور سلسلے ہیں جو انسانیت کی اصلاح و فلاح کے لئے مدتوں سے دن رات خانقاہوں میں مصروفِ ریاضت ہیں مثلاً۔ چشتیہ، سہروردیہ، قادریہ، نقشبندیہ، مجددیہ، غوثیہ، اویسیہ، شطاریہ، نظامیہ، صابریہ وغیرہ۔ اگر دکاندار بھی رُوحانی قوتوں کا مالک ہے تو آخر اس کا سلسلہ کونسا ہے ؟ تو اس کا جواب کچھ مشکل نہیں۔ کیونکہ دکاندار مصنوعات سے زیادہ صنعت کاری میں دلچسپی لیتا ہے۔ اور منافع سے زیادہ اُس کے منابع پر نظر رکھتا ہے۔ اِس لئے اُس نے اپنا کوئی نیا سلسلہ بنانے کی بجائے انہی سلسلوں کو اپنا لیا اور اپنے رُوحانی تصرّف سے کام لے کر خانقاہ کو دکان اور خانقاہی نظام کو دکانداری بنا ڈالا۔ الا ماشاء اللہ۔

البتہ ایک غلطی ہم سے یہ ہُوئی کہ ہم نے اب تک بہت اُونچے درجے کے تاجروں اور دکانداروں کا ذکر کیا ہے۔ اور اُس شریف النفس مسکین طبع اور جی حضور قسم کے دکاندار کا ذکر نہیں کیا جو صُبح سویرے، نماز پڑھ کر یٰسین شریف کا ورد کرتے ہُوئے، محلّے میں اپنی دُکان کھولتا ہے۔ صفائی کرتے ہُوئے گرد جھاڑتا اور یٰسین شریف پھونکتا جاتا ہے۔ آپ کو اِس کی دکان کے اندر کئی قسم کے تعویذ اور نقش آویزاں نظر آئیں گے۔ جو رزق میں برکت کے لئے اُس نے مختلف خانقاہوں یا بڑی دکانوں سے خریدے ہوتے ہیں۔ وُہ گنتی شرُوع کرے گا۔ تو ایک کہنے کی بجائے ہمیشہ برکت کہے گا۔ اِس سارے اہتمام سے اُسے یہ فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ کہ اُسے کارکنانِ قضا و قدر کی امداد کا یقین ہو جاتا ہے۔ اور ہمیں یہ فائدہ حاصل ہوتا ہے کہ اُس کی للّٰہیت سے متاثر ہو کر ہم اپنی اصلاح کی طرف مائل ہو جاتے ہیں کہ جب یہ شخص باوجُود کاروبار میں مصروف ہونے کے اپنے خالقِ حقیقی سے لو لگائے ہُوئے ہے تو ہم اپنے کارِ منصبی میں مشغولیت کے ساتھ ساتھ آخر ایسا کیوں نہیں کر سکتے ؟۔

اس کی کامیابی اور اپنی ناکامی کا یہ احساس ہمیں تجزیے کی طرف مائل کر کے اس نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ ہماری خرابی و ناکامی کی اصل وجہ بہت سی چیزوں کا بیک وقت سوچنا ہے۔

ہم لوگ، سوچتے ہوئے، بے شمار مختلف چیزوں کو آپس میں گڈمڈ کر کے فکری انتشار کے مرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اور کسی واضح نتیجہ کے اخذ کرنے یا طرزِ عمل کے متعین کرنے میں اکثر ناکام رہتے ہیں۔ جب کہ اُس کا طریق کار اور طرزِ عمل ایسا صاف سُتھرا اور واضح ہے کہ چیزیں آپس میں گڈمڈ نہیں ہوتیں۔ وہ ہر چیز کو اس کی مناسب جگہ پر رکھنے کا قائل ہے۔ چنانچہ مال خریدنے کے باٹ اپنی مخصوص جگہ پر ہوں گے اور مال بیچنے کے باٹ اپنی مقررہ جگہ پر۔۔۔ اصل حساب کتاب کے رجسٹر اپنی جگہ ہوں گے اور انکم ٹیکس کے لیے تیار کردہ رجسٹر اپنی جگہ پر۔ یہ حسنِ ترتیب آپ کو اس کے ہاں اشیاء سے آگے، خیالات تک میں نظر آتے گا۔ مثلاً وہ جانتا ہے کہ نماز اور اوراد و وظائف سے رزق میں برکت ہوتی ہے۔ لیکن کم تولنے، نقلی و ناقص مال یا ملاوٹ والی جنس بیچنے سے جو فوری برکت اور نفع حاصل ہوتا ہے وُہ اُسے بھی نظر انداز نہیں کرتا۔ اور پھر ضرورت مندوں کو مناسب قیمت پر اشیائے صرف مہیا کرنے میں آخرت کے جو منافع ہیں وہ مستزاد ہیں۔ چنانچہ یہ شخص اپنے خیالات و معاملات میں اِسی صفائی اور ایسے حسن ترتیب کے سبب جو ہر قسم کے ابہام سے بالاتر ہوتا ہے۔ دُنیا میں کامیاب ہوتا ہے اور آخرت میں کامیابی کی اُمید۔ بلکہ یقین رکھتا ہے۔ ہم لوگ مغلوبِ گماں ہیں اور وُہ صاحب یقین ہے۔

انشائیہ

اُداس آئینے

——— مشکور حسین یاد

اگر کوئی بوڑھا شخص آئینہ دیکھتا ہے تو سمجھ لیجئے وہ بوڑھا نہیں۔ آئینے کا تمام تر تعلق ہمت اور توانائی سے ہے۔ آئینہ دیکھنے کے لئے حوصلہ منداور طاقتور ہونا ضروری ہے۔ کمزور آدمی آئینہ دیکھنے کی بہت کم جرأت کرتا ہے۔ اور میرا کہنا ہے کہ اُداسی ایک آئینہ ہے جس کا صاف مطلب یہ ہُوا کہ بوڑھے اور کمزور آدمی یا تو بالکل اداس نہیں ہوتے اور اگر ہوتے ہیں تو بہت کم۔ اس ضمن میں ایک بات قابلِ غور یہ ہے کہ اُداسی کا مایوسی سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں۔ میرا مطلب ہے اُداس آدمی کے لئے ضروری نہیں کہ وہ مایوس بھی ہو ——— بلکہ اگر سچ پوچھئے تو اُداسی ایک ایسی لطیف اور نازک کیفیتِ قلب ہے جس کو مایوسی کا ایک ہلکا سا جھونکا بھی تہس نہس کرنے کے لئے کافی ثابت ہو سکتا ہے۔ اِس لئے زیادہ دیر اُداس رہنا کوئی آسان کام نہیں۔ ایک اور قابلِ غور بات یہ ہے کہ اُداسی کی کیفیت خوشی اور ناخوشی کی کیفیات سے بلند و بالا ہوتی ہے۔ خوشی میں آدمی کے آپے سے باہر ہو جانے کا خطرہ لاحق رہتا ہے اور ناخوشی میں اُس کے اپنے خول میں چلے جانے کا اندیشہ برقرار ——— اُداسی اِس نوع کی افراط و تفریط سے آزاد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُداس آدمی کو خوش یا ناخوش کہہ دینا آسان نہیں۔ وُہ قلب کی اِن عام کیفیات کے پیمانوں

کی گرفت سے باہر ہوتا ہے۔ اُداسی کے ضمن میں ایک اور غلط فہمی کو دُور کرنا بھی ضروری ہے اور
وُہ یہ کہ ہم اُداسی کو افسردگی سے تعبیر نہیں کر سکتے۔ اُداسی میں آدمی کے دِل کا چراغ بُجھتا کبھی نہیں، ہاں
یہ ضرور ہے کہ اُداس آدمی کے چراغِ دِل کی لَو میں شدّت نہیں رہتی۔ بلکہ یُوں کہا جائے تو زیادہ صحیح
ہے کہ اُداسی نتیجہ ہی چراغِ دل کی لَو کے بھڑک اُٹھنے کا ہے۔ اگر یہ لَو نہ بھڑکے اور اپنے اعتدال پر
رہے تو ہم کبھی اداس نہ ہوں۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ آدمی خواب دیکھنے سے کبھی باز نہیں
آتا اور اُسے باز آنا بھی نہیں چاہیئے۔ اگر خُدانخواستہ ایسا ہو جائے تو زندگی کی ساری عزّت و آبرو
خاک میں مِل جاتی ہے۔ لیکن خواب دیکھنے کے ہزاروں طریقے ہیں۔ عام طور پر آدمی چشم زدن میں
خواب اور اُس کی تعبیر کو پانا چاہتا ہے۔ اور خواب دیکھنے کا یہ طریقہ سب سے زیادہ مقبول ہے۔ ہم
اپنی خواہشات کو بروئے کار لانے میں کسی قسم کی تاخیر نہیں چاہتے۔ اِس لیے آرزُومند رہتے ہیں
کہ آنکھ جھپکنے میں ہماری تمنّائیں پُوری ہو جائیں۔ اِدھر تکمیلِ تمنّا کے لیے حقائق کی ٹھوس دُنیا میں
آنا پڑتا ہے۔ جہاں تگ و دو بھی لازمی ہے اور اُس کے لِئے ایک مدّت بھی بے حد ضروری۔ ویسے
خواب دیکھنا خواہ کتنا ہی دل خُوش کُن امر کیوں نہ ہو اِس کارِ خُوبی کے ساتھ یہ خرابی ہمیشہ لگی رہتی
ہے کہ خواب دیکھنے والا خواب دیکھنے کے عمل میں مبالغہ سے ضرور کام لیتا ہے۔ مُبالغہ اِنسان کے
ذوقِ تکمیل کا مظہر یقیناً ہے لیکن مبالغہ سے اِنسان کے دِل و نگاہ میں طُوفان برپا ہوتے ہیں اب
خواہ یہ طوفانِ جمال ہوں یا طُوفانِ جلال، اِنسانی زندگی میں اِن طُوفانوں کی اپنی ایک حیثیت ہے مگر
مسلسل طُوفان آتے رہیں تو یہ بھی کوئی صحت مند بات نہیں۔ طوفان کے بعد ایک ٹھہراؤ کی
اشد ضرورت ہے۔ اُداسی اِنسان کی ذات کے اُسی اہم ٹھہراؤ کا نام ہے۔ اُداس ہو کر آدمی اپنے
خوابوں پر تنقید کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ دُوسرے اِس ٹھہراؤ کی بدولت اپنی صلاحیتوں اور
قوّتوں کے بارے میں اُسے بہت سی کار آمد معلُومات حاصل ہو جاتی ہیں۔

اِس طرح دیکھا جائے تو اُداسی عرفان و آگہی کا ایک ایسا دھیرے دھیرے بہتا ہُوا چشمہ
نظر آتی ہے جو انسان کے قلب و نظر کو عجیب انداز میں سیراب و شاداب کرتا چلا جاتا ہے۔

انسان اداس نہ ہو تو یقینی امر ہے کہ اُس کے دل و نگاہ کی بیشتر کھیتیاں خشک ہو کر ویران ہو جائیں۔ اِس کے علاوہ اُداسی اِنسان کے صاحبِ بصیرت ہونے کا بھی پتہ دیتی ہے۔ آپ نے کسی بیوقوف اور احمق آدمی کو اُداس ہوتے نہ دیکھا ہو گا۔ اور اگر کبھی آپ ایسا دیکھیں تو سمجھ لیجئے اُس پر کسی شعور کا ظہور ہو رہا ہے۔ اہلِ ہوس اور دُنیادار لوگ بھی کم اداس ہُوا کرتے ہیں۔ اور پھر اُن کی اُداسی خالص اُداسی بھی نہیں رہتی۔ اُس میں کسی نہ کسی طور مایوسی ضرور شامل ہو جاتی ہے۔ غرض اُداس ہونا کوئی معمُولی بات نہیں صحیح معنی میں آدمی اُسی وقت اداس ہوتا ہے جب اُس کی شخصیت میں اعلیٰ اِنسانی صفات مجتمع ہوتی ہیں۔ اُداسی دلیلِ حکمت و دانائی ہی نہیں یہ تو دلیلِ جسارت بھی ہے، دلیلِ غیرت بھی اور دلیلِ شرافت بھی۔ غیرت مند اور خُود دار لوگ اس دنیا میں سب سے زیادہ اُداس ہوتے ہیں۔

ویسے اُداسی چُونکہ ایک آئینہ کے مانند ہے اِس لئے لمحے دو لمحے کے لئے تو ہر انسان اپنی زندگی میں اُداس ہو ہی جاتا ہے۔ میرا مطلب ہے آئینے پر اُچٹتی ہُوئی نظر تو ہر کسی کی پڑ جاتی ہے اور پڑ سکتی ہے۔ البتہ ایسے افراد کی ابھی اِنسانی معاشرے میں بڑی قلت ہے جو اطمینان کے ساتھ اپنی پُوری شخصیت پر نگاہ ڈالنے کی ہمت رکھتے ہیں یعنی جو واقعی کچھ عرصہ کے لئے مسلسل اُداس رہ سکتے ہوں۔ آپ نے آئینوں کو گرد آلُود یا صاف و شفاف، ہنستے مُسکراتے تو اکثر دیکھا ہو گا۔ لیکن اداس آئینے آپ کی نظر سے بہت کم گذرے ہوں گے۔ آئینے اُداس نظر آئیں تو سمجھ لیجئے زندگی عافیت کی طرف قدم بڑھا رہی ہے۔

انشائیہ

اِنکسار کے آسمان

مشکور حسین یاد

اگر کوئی شخص آپ سے جُھک کر گلے مِل رہا ہے تو یُوں سمجھ لیجئے ایک آسمان آپ سے بغل گیر ہو رہا ہے کیونکہ ایک اِنسان کا جُھکنا زمین کو چھُونے کی بات نہیں، زمین کو آسمان سے ہم آغوش کرنے والی بات ہے۔ دیکھئے نا آسمان بھی تو زمین پر جُھکا ہُوا نہ جانے کب سے اسے یعنی زمین کو اپنی بلندیوں میں شامل کرنے کے عمل میں مصرُوف ہے۔ تو گویا ہر آدمی ایک آسمان ہے۔ جِس طرح آسمان کی کوئی حد نہیں، اِسی طرح آدمی کی بھی کوئی حد نہیں۔ آدمی آسمان کی طرح بے حد و حساب ہے۔ لیکن آدمی کے آسمان ہونے کا پتا اُسی وقت چلتا ہے۔ جب وہ کسی سے جُھک کر ملتا ہے آسمان کے آسمان ہونے کی خبر بھی تو ہمیں اُس کے جُھکنے سے مِل رہی ہے۔ اور جس طرح آسمان خلا ہونے کے باعث یعنی کُچھ بھی نہ ہونے کے باعث بہت کُچھ ہے، چاند، ستاروں اور کہکشاؤں سے بھرپُور، اسی طرح ہر شخص اپنے انکسار کے باعث کُچھ نہ ہونے کے باوصف بہت کُچھ ہوتا چلا جاتا ہے۔ طرح طرح کے سُورج چاند ستاروں سے بھرپُور۔ نو بہ نو اور تازہ بہ تازہ دُنیاؤں سے آباد۔ قصّہ دراصل یہ ہے کہ انکسار کے باعِث ایک اِنسان کچھ گنواتا نہیں بلکہ اس کے برعکس اپنی ذات میں وسعتیں، بلندیاں اور گہرائیاں پیدا کرتا ہے اور جب کسی ذات میں وسعتیں، بلندیاں اور گہرائیاں سمٹ

آتی ہیں تو اُس میں طرح طرح کے سُورج، چاند، ستارے اور کہکشائیں خُود بخُود ظہُور میں آنے لگتے ہیں۔ اِسی لیئے بڑے آدمیوں میں آپ نے انکسار دیکھا ہو یا نہ دیکھا ہو لیکن انکسار کرنے والے افراد میں آپ نے کسی نہ کسی نوع کی عظمت اور بڑائی کا مشاہدہ ضرور کیا ہوگا۔ انکسار اگر کسی تکلف کا حامل نہیں (جس میں احساسِ کمتری کا تکلف بھی شامل سمجھیئے) تو پھر اِس میں بڑائی کا پایا جانا لازمی ہے۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ کوئی شخص سچے اور منزہ انکسار سے کام لے اور اُس میں بڑائی موجود نہ ہو۔ بڑائی تو جنم ہی انکسار کے ساتھ لیتی ہے۔ حقیقی اور سچی بڑائی ہو یا حقیقی اور سچا انکسار، اِن دونوں کو آپ ایک دُوسرے سے جُدا نہیں کر سکتے۔ ویسے عظمت اور بڑائی میں انکسار کو یُوں سمجھ لیجئے جس طرح آسمان میں خلا۔ اور انکسار میں عظمت اور بڑائی کی مثال ایسی ہے جیسے خلاؤں میں سورج، چاند، ستارے اور کہکشائیں۔

جیسا کہ ابھی ابھی عرض کیا گیا ہے کہ آدمی انکسار سے کام لیتا ہے تو اپنے پاس سے کچھ گنواتا نہیں۔ انکسار کا عمل تو آغوش وا کرنے کا عمل ہے۔ اپنے دیدہ و دل کی آغوش، اپنی جان و رُوح کی آغوش۔ واضح رہے کہ آغوش وا کرنا، ہاتھ پھیلانے یا جھولی پھیلانے والی بات ہرگز ہرگز نہیں ہے۔ انکسار کرنے والا آدمی اپنے ہاتھ پھیلاتا نہیں۔ اُنھیں دراز سے دراز تر کرتا ہے یعنی اُن کی رسائی کو فروغ دیتا ہے۔ ایسے شخص کے ہاتھوں کی رسائی کم سے کم دامنِ یزداں تک ہوتی ہے۔ اور پھر منکسر المزاج آدمی کے ہاتھ ہی مضبُوط اور توانا نہیں ہوتے۔ اُس کے پاؤں بھی مضبُوط اور اپنی جگہ قائم رہنے کے اعتبار سے کوہ صفت ہوتے ہیں۔ اِسی لئے آپ نے کبھی انکسار سے کام لینے والے شخص کے پاؤں ڈگمگاتے نہیں دیکھے ہوں گے۔ وہ تو اطمینان کا ایک مُرقّع ہوتا ہے۔ خُوش رنگ، خُوش نُور، معصُومیّت کے نقش و نگار سے بڑے لطیف انداز میں آراستہ و پیراستہ، گویا انکسار آدمی کو فراخ دست اور فراخ دِل ہی نہیں بناتا، اُسے ثابت قدم بھی رکھتا ہے۔ ویسے اہلِ انکسار کی ثابت قدمی عام طور پر مخفی رہتی ہے۔ لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ انکسار میں آدمی اپنے آپ کو پیچھے ہٹا رہا ہے یا اپنی نفی کر رہا ہے۔ انکسار

کی اس صُورتِ حال کو سمجھنے کے لیئے یہاں غالباً اس لفظ کے لغوی معنی پر غور کرنا ضروری ہے۔
اِنکسار کے لغوی معنی شکست یعنی ٹوٹنے کے ہیں۔ لیکن اِنکسار میں اِنسان کا ٹوٹنا کچھ ایٹم کے ٹوٹنے
کی طرح کا ٹوٹنا سمجھیئے۔ یعنی انکسار کے ذریعے اِنسان ایک انوکھے انداز میں اپنی طاقت کا مظاہرہ
کرتا ہے۔ انوکھا انداز میں نے اِس لیئے کہا ہے کہ ایٹم کی شکست سے ایٹم بم بنایا جا سکتا ہے۔ لیکن
نکسار کے باعث جو انسانی طاقت ظہور میں آتی ہے، اُس سے بم کی قسم کی کوئی چیز نہیں بنائی جاتی۔
یر امطلب ہے انکسار کی بدولت جو انسانی طاقت ہمیں حاصل ہوتی ہے اُس سے انسان کی بھلائی
ی کا کام لیا جاتا ہے۔ اہلِ انکسار تخریب کے بالکل قائل نہیں ہوتے۔ اِنکسار میں تو خیر ہی خیر کار فرما
وتی ہے۔ یہاں تباہی و بربادی کا تو کہیں دُور دُور بھی نام و نشان نظر نہیں آتا۔
اِنکسار کے ضمن میں عاجزی اور فروتنی کے الفاظ بھی عموماً اِستعمال کیئے جاتے ہیں۔ لیکن اِس
ضمن میں بھی ان لفظوں کے مفاہیم کو سمجھنا ازبس ضروری ہے۔ ایک منکسر المزاج اِنسان کی عاجزی
کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وُہ کچھ کر گزرنے سے عاجز ہو گیا ہے یا وُہ اپنے ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ چکا
ہے۔ اِنکسار میں عاجزی کا مفہُوم یہ واضح کرتا ہے کہ انکسار کرنے والا کسی دُوسرے شخص کو نقصان
نہیں پہنچا سکتا یعنی وہ کسی کا نقصان کرنے سے عاجز ہے اور اُس کی فروتنی کا مطلب یہ ہوتا ہے۔
کہ وہ اپنے آپ کو اتنا بڑا ہرگز خیال نہیں کرتا کہ اب اُس کے مزید بڑا ہونے کا امکان باقی نہیں ہے۔
اِنکسار سے کام لینے والے شخص کی عاجزی ایک عافیت ہوتی ہے اور اُس کی فروتنی ایک رحمت،
جس میں ارتقاء کے امکانات ہمیشہ موجُود رہتے ہیں۔ اِنسان کے انکسار کی شکست کو بہ نہایت آسانی
کے ساتھ ایسی خُوش آئند واردات سے تعبیر کیا جا سکتا ہے جس کی قسمت میں فتح و ظفر کے علاوہ اور
کچھ نہیں ہوتا۔ ایک اِعتبار سے دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اِنسان اپنے اِنکسار کے ذریعے
زندگی کے اُن رستوں کی ناہمواریوں کو توڑتا ہے جو نہ صِرف اُس کے سفرِ حیات میں حائل ہوتی ہیں۔
بلکہ اُس کے ساتھ دُوسروں کی راہ بھی کھوٹی کرنے کا باعث بنتی رہتی ہیں
غالباً اسی لیئے اِنکسار سے کام لینے والے افراد چلتی پھرتی دُعاؤں کی طرح ہوتے ہیں،

اپنے لیۓ بھی اور دُوسروں کے لیۓ بھی۔ ایسی دُعائیں جن کی برکتوں کا سلسلہ کبھی مُنقطع نہیں ہوتا۔ ان لوگوں کی تو ہر سانس اور ہر جنبشِ مژہ باغِ حیات کو پھولنے اور پھلنے کے مواقع بہم پہنچاتی رہتی ہیں۔ انکسار کا یہ پہلو بے حد تر و تازہ اور بہار پرور ہے۔ بہار کے لفظ نے انکسار کے لغوی معنی کی طرف ذہن کو پھر منتقل کر دیا ہے۔ شکست کا ایک خُوبصورت اور لطیف انداز کلیوں کا چٹکنا بھی تو ہے۔ جسے عُرفِ عام میں شگفتگی کا نام دیا جاتا ہے۔ بس یُوں سمجھیۓ انکسار کے وقت انکسار کرنے والے انسان کی شخصیّت ٹُوٹتی یا شکستہ نہیں ہوتی۔ کلیوں کی طرح چٹکنے لگتی ہے۔ لیکن یہ سلسلہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا انکسار کرنے والے کے ساتھ اُس کے حلقۂ اثر میں وہ شخص بھی پُوری طرح آ جاتا ہے جس کے ساتھ انکسار برتا جا رہا ہے۔ یعنی انکسار دُوسرے شخص کی ذات کو بھی گلشن بنا دیتا ہے۔ البتہ اِس دُوسرے شخص کو احساس سے عاری نہ ہونا چاہیۓ۔ کیُونکہ منکسر المزاج آدمی تو صد فی صد حسّاس اور ذی شعُور ہوتا ہے۔ دُوسرا فریق بھی ایسا ہی ہو تو انکسار کی بدولت دونوں جانب بہار کا رنگا رنگ سماں پیدا ہونا یقینی امر ہے۔

یہاں اِس ضمن میں شکستہ ہونے اور شگفتہ ہونے کی مزید تشریح کرنا ضروری معلُوم ہوتا ہے۔ یُوں تو شکستہ ہونے اور شگفتہ ہونے کا آغاز ٹُوٹنے ہی سے ہوتا ہے۔ لیکن شکستہ ہونے اور شگفتہ ہونے میں بُنیادی فرق یہ ہے کہ شگفتگی کے بعد ٹوٹنے پھُوٹنے کا سلسلہ مُشکل ہی سے ختم ہونے میں آتا ہے۔ اِدھر شگفتگی کی ابتداء تو یقیناً ٹُوٹنے ہی سے ہوتی ہے لیکن ٹُوٹ پھُوٹ کا یہ سلسلہ بہت جلد ختم ہو جاتا ہے۔ بلکہ ٹوٹنے کے ساتھ ہی مجتمع ہونے کا ایک ایسا حسین آغاز ظہُور میں آنے لگتا ہے جس کے ساتھ زندگی کا استحکام ہی وابستہ نہیں ہوتا۔ اُس کا حُسن و جمال بھی وابستہ ہوتا ہے۔ گویا شگفتگی میں نظم و ضبط بھی ہوتا ہے اور حُسن و زیبائی بھی۔ اب چُونکہ اہلِ انکسار پر مسلسل شگفتگی کے نو بہ نو عالم گزرتے رہتے ہیں۔ اِس لیۓ یہ لوگ اپنی جگہ مستحکم بھی ہوتے ہیں اور اُن کی شخصیت میں دلکشی و رعنائی کا بھی کوئی ٹھکانہ باقی نہیں رہتا۔

اِس کے علاوہ منکسر المزاج لوگوں میں دلکشی و رعنائی کی ایک اور بڑی وجہ بھی ہے۔ انکسار

کے ساتھ نقد ونظر کے رشتے بھی بڑے گہرے اور مضبوط طور پر قائم ہوتے ہیں۔ بلکہ سچ پوچھئے تو انکسار آدمی میں پیدا ہی اس وقت ہوتا ہے جب وہ اپنے آپ پر کھُلے دِل سے تنقید کرنا سیکھ لیتا ہے۔ اور یہ بات کسے معلوم نہیں کہ جو شخص اپنی ذات کو تنقید کا نشانہ بنانا جانتا ہے اُس سے لوگ خواہ مخواہ پیار کرنے لگتے ہیں۔ خواہ مخواہ میں نے اس لئے کہا ہے کہ اہلِ دُنیا انکسار کرنے والے اشخاص کو عام طور پر ڈھیلے ڈھالے اور غیر فعال افراد سمجھتے ہیں۔ لیکن وہ اُنہیں اِس کے باوجود اپنے دِل کی گہرائیوں سے پسند بھی کرتے ہیں۔ انکسار کرنے والوں سے پیار کرنا اہلِ دُنیا کی مجبوری ہے۔ اِنکسار شیوہ لوگوں کی شخصیت چودھویں رات کی چاندنی کی طرح ہوتی ہے۔ جس کا نُور اپنے سامنے کے سارے منظر کو فیض یاب کرتا رہتا ہے اور یوں ہر گھر میں چاندنی کی کلیاں چٹکتی رہتی ہیں۔ گویا یہ بھی شکست کی ایک لطیف صورت کہی جاتی ہے۔ شکست کی اِس لطیف صورت کے ساتھ ساتھ ہی اہلِ انکسار ایک اور لطیف ترین مگر مضبوط ترین صورتِ حال سے بھی دوچار رہتے ہیں۔ یعنی اِنکسار سے کام لیتے وقت اپنی ذات کو ہیرے کی طرح تراش رہے ہوتے ہیں۔ اور جس طرح ہیرے میں جتنی زیادہ تراشیں آئیں گی اتنا ہی زیادہ وہ قیمتی اور چمکدار ہوتا چلا جائے گا۔ کچھ اسی طرح کا معاملہ انکسار سے کام لینے والوں کا بھی ہے۔ آپ فرمائیں گے چٹکنے اور تراشنے کے یہ سب عمل انکسار کے لغوی معنی شکست سے بالواسطہ تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن ایسا نہیں۔ انکسار کے اصل لغوی معنی شکست سے اہلِ انکسار کا براہِ راست بھی تعلق ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی شکست و ریخت کے عمل سے فارغ نہیں ہوتے۔ یعنی وہ ہر لمحہ اپنے تیشۂ صفات سے اپنی ذات کے غرور ونخوت کو ریزہ ریزہ کرنے میں مصروف رہتے ہیں — اور یوں جیسے جیسے اُن کی فضاء ذات سے غرور و نخوت کے کُرے پاش پاش ہوتے ہیں۔ ویسے ویسے اُن کی طبع بلند کے لئے نئے نئے آسمان تخلیق ہوتے چلے جاتے ہیں۔ بالکل وہی اِنکسار کے آسمان جن کی نہ بلندیوں کی حد ہے اور نہ کوئی وسعتوں کی حد۔ مزید لُطف کی بات یہ ہے کہ انکسار کے ان آسمانوں کے سامنے غرور و تکبّر کا آسمان بھی تو ایک لمحہ کے لئے ٹھہرنے کی تاب نہیں رکھتا۔ کہتے ہیں

آدمی جب اپنا غرور توڑنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو پھر اُس کے سامنے دُنیا کا بڑے سے بڑا غرور بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے انکسار کا سب سے بڑا اور کاری وار دُنیا کے غرور ہی پر آ کر پڑتا ہے اور اسی کاری وار کے صدقے میں سچّی بلندیوں اور ارتقاء کے آسمان وجُود میں آتے ہیں۔ جی ہاں ارتقاء کے آسمان، اِنکسار کے آسمان، اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّآلِہٖ

انشائیہ

چھینک

ڈاکٹر انور سدید

یہ پار سال کی بات ہے۔ موسم کا درجۂ حرارت نقطۂ انجماد کے قریب پہنچ چکا تھا اور
میں نے اپنے جسم کو سردی کی یورش سے بچانے کے لئے سر سے پاؤں تک اونی ملبوسات میں
لپیٹ رکھا تھا۔ اچانک سرد ہوا کی ایک خود سر اور شوریدہ لہر آئی اور میرے ناک کی سرنگوں سے
اندر داخل ہونے کی کوشش کرنے لگی۔ میں نے دیکھا کہ میرے جسم کی محافظ قوتیں اس ناگہانی
حملے سے آنِ واحد میں نبرد آزما ہو گئیں اور پھر دونوں طرف ہر چہ بادا باد کی صورت پیدا ہو گئی۔
بلاشبہ سرد لہر کا حملہ کمینے دشمن جیسا تھا۔ دشمن رات کی تاریکی میں آگے بڑھا تھا اور اعلانِ
جنگ کئے بغیر میری سرحدوں کو عبور کر رہا تھا۔ لیکن میرا جسم بقا کے لئے دفاع کی مہذب جنگ
لڑ رہا تھا۔ اس نے پہلے ہلکے توپ خانے سے شوں شاں، شوں شاں کر کے دشمن کو خبردار کیا۔
پھر اس کے داخلے کے دروازے بند کئے۔ فصیلوں پر متعین چوکیداروں کو چوکنا کیا اور یہ سب
انتظامات کرنے کے بعد دشمن پر اعصابی دباؤ ڈالنے کے لئے تیزی سے غرغر کرنا شروع کر دیا۔
مقصد یہ تھا کہ آگے بڑھنے کی بجائے دشمن جس راستے سے آیا، اسی سے واپس چلا جائے۔
لیکن جب میں نے دیکھا کہ دشمن کمینگی سے باز نہیں آ رہا تو میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، مدافعت

کی پوری قوت سے چھینک مار دی۔

یہ چھینک کیا تھی ؟ کئی ہزار کلو گرام کا وزنی ایٹم بم، جس نے چھوٹتے ہی دشمن کے چھکے چھڑا دیئے اور قبل اس کے کہ دشمن دوبارہ حملے کے لئے اپنی فوجیں آراستہ کرتا، میں نے اپنا منہ، ناک اور آنکھیں اونی ٹوپی سے ڈھانپ لیں اور مطمئن ہو گیا کہ اب سردی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ لیکن صاحب کمینے دشمن کا حملہ ابھی ناکام نہیں ہوا تھا۔ وہ پسپا ہوتے ہوتے بھی قلعے کی دیواروں کو شکستہ کر گیا تھا اور اس کے کچھ سلحشور فرار کی راہ نہ پا کر میرے قلعے کے کسی خفیہ کونے میں چھپنے میں کامیاب ہو گئے تھے اور مسلسل انگیخت دے رہے تھے۔ اب میں نے بچے کھچے دشمنوں سے نمٹنے اور ان کے فرار کے راستوں کو مسدود کرنے کے انتظامات کئے۔ ہونٹوں کے ساحلوں سے جو شاہراہ گلے کی طرف جاتی ہے۔ اس پر مضبوط بند باندھ دیا اور پھر ایک چھینک کے بعد دوسری چھینک اور دوسری کے بعد تیسری چھینک سے چھپے ہوئے دشمن پر پے در پے اندھا دھند بم برسانے شروع کر دیئے۔ ہر چھینک کامرانی کا پیغام لاتی اور مجھے یوں محسوس ہوتا کہ اب دشمن کا قلع قمع پوری طرح ہو چکا ہے۔ لیکن یہ تو خیالِ خام تھا میں جونہی آسودگی کا سانس لیتا، دشمن کے گوریلے سرسراہٹ کرتے، کہیں سے سر ابھارتے اور مجھے پھر آمادۂ جنگ کر دیتے۔ بلا شبہ اس نبرد آزمائی میں میرے جملہ حواسِ خمسہ میرے معاون تھے لیکن جلد ہی مجھے احساس ہو گیا کہ دشمن کو مکمل اور فیصلہ کن شکست دینے کے لئے جنگ کو طول دینا اور ایک لمبا پلان بنانا ضروری ہے۔ میں نے یہ تاریخی جنگ پورے سات دن تک اور سات راتوں کے جانکاہ حملوں سے جیتی ہے۔ لیکن اب حالت یہ ہو گئی ہے کہ مجھے دشمن کا کھٹکا ہر وقت لگا رہتا ہے اور میں چھینکوں کا ذخیرہ اپنے گرد و پیش میں جمع رکھتا ہوں۔ صبح اٹھتے ہی جب تک آٹھ دس مسلسل چھینکیں مار کر یہ یقین نہ کر لوں کہ دشمن قرب و جوار سے سر نہیں ابھار سکتا اور اس کے کشتوں کے پشتے لگ گئے ہیں۔ اپنے بستر سے باہر نہیں نکلتا۔ چھینک میری محافظ بن گئی ہے۔ اور میں اس کے بغیر محفوظ زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

چھینک کو ہماری عملی زندگی میں کتنا دخل ہے ؟ اس موضوع پر تا حال قومی سطح پر کوئی تحقیق

نہیں ہُوئی، مَیں نے اِس موضُوع پر تھوڑا سا تحقیقی کام کیا ہے اور وثوق سے کہہ سکتا ہُوں کہ اِنسان نے اب تک جتنی معروضی حقیقتیں دریافت کی ہیں۔ اُن میں ایک اہم معروضی حقیقت چھینک بھی ہے عام طور پر روایتی قسم کے شرفا۔ اِسے ایک غیر تہذیبی اور اضطراری عمل شمار کرتے ہیں اور اس سے ہمیشہ آنکھیں چُراتے رہتے ہیں۔ اِس قسم کے بزدل بزرگوں کو بھری محفل میں چھینک آجائے تو محفل کو زعفران زار بنانے کی بجائے محفل سے اُٹھ جانے میں ہی بہتری سمجھتے ہیں۔ سرسری نظر سے بھی دیکھئے تو یہ تصویر کا صِرف ایک رُخ ہے۔ اِس کا دُوسرا رُخ ڈاکٹر "س" نے آشکار کیا ہے۔ ان کے نظریے کے مُطابق چھینکنا ایک مجلسی فعل ہے اور اِس کے افادی زاویے کو سماجی اِعتبار سے بھی اہمیت حاصل ہے۔ اِس نظرئیے کے ثبوت میں ان کی مضبُوط دلیل یہ ہے کہ چھینکنے والا اِس عمل کے بعد الحمد للہ کہتا ہے اور چھینک سُننے والا جواباً یرحمکم اللہ، اور جس عمل میں دو آدمی برضا و رغبت شریک ہوں۔ اُس میں معاشرے کا کوئی نہ کوئی افادی پہلو ضرور موجُود ہوتا ہے۔

ڈاکٹر "س" نے چھینک کے مزید فوائد بھی دریافت کئے ہیں۔ مثال کے طور پر قبل از چھینک ناک میں جو لطیف سی کھُجلی ہوتی ہے، یہ بنیادی تحریک کا عمل ہے اور مُعاشرے کے جمُود کو توڑ کر فرد کو مائل بہ حرکت کرسکتی ہے۔ ناک کی کھُجلی اور چھینک کے درمیان جو قلیل سا وقفۂ اضطراب ہے، اس کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانا تو ممکن نہیں۔ اِنسان اگر اپنے اوسان بجا رکھے تو وہ اِس وقفے میں سیاسی، سماجی اور معاشرتی مسائل کا وہبی حل بآسانی تلاش کر سکتا ہے۔ اِس لمحے میں اِنسان کے جُملہ حواس صرف ایک نقطے پر جمع ہوتے ہیں اور دُنیا کی کوئی خارجی قوّت ان میں اِنتشار پیدا نہیں کرسکتی۔ ارتکازِ فکر کا یہ عرفانی لمحہ جُونہی گزر جاتا ہے تو اِنسان متاسف ہوتا ہے۔ اپنی آبناؤں ہی میں ڈوبنے لگتا ہے اور اپنے ساحلوں کی حفاظت بھی نہیں کرسکتا۔ تاسف کی یہ آہِ دل دوز جب چھینک میں ڈھل جاتی ہے۔ تو اس کی اِطلاع گرد و پیش میں بیٹھے ہُوئے سب احباب کو بھی ہو جاتی ہے۔ چُنانچہ اِن میں سے بیشتر اپنی جیبوں سے رُومال نکال لیتے ہیں اور اپنی تابندہ پیشانیوں، رخشندہ رُخساروں اور نمائندہ ناکوں پر پھیرنا شرُوع کر دیتے ہیں۔ تاہم یہ نہ سمجھئے کہ

چھینکنے والا اپنے دوستوں کو فاتحانہ شان سے دیکھتا ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کی اپنی آنکھوں سے بھی اِس وقت ایک جوئے رواں بہہ نکلتی ہے۔ اور وُہ خُود بھی دُوسروں سے رحم کی بھیک ہی مانگ رہا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر "س" نے اِس لمحے کو کتھارسس کا لمحہ قرار دیا ہے اور فرمایا ہے کہ جب کوئی فرد چھینکتا ہے تو اِس کا جذباتی تشنّج دُور ہو جاتا ہے۔ لیکن جب کوئی قوم چھینکتی ہے تو پُورا معاشرہ آسُودگی کا سانس لینے لگتا ہے۔ المیہ یہ ہے کہ فرد کی چھینک تو اضطرار کے کسی لمحۂ غنیمت میں خود بخود وارد ہو جاتی ہے لیکن قوم کے داخل سے چھینک بیدار کرنے کے لئے اُسے خُود احتسابی کے عمل سے بھی گُذرنا پڑتا ہے اور خُود احتسابی کا جراحت آمیز عمل مشرقی اقوام نے تاحال اختیار نہیں کیا اور یہی وجہ ہے کہ وہ عرصے سے خوابِ خرگوش میں مدہوش ہیں اور چھینکنے کی بجائے خراٹے مار رہی ہیں۔

بعض لوگ خراٹے بھرنے کے عمل کو بھی تعمیری فعل شمار کرتے ہیں اور اُسے چھینک کے عمل کے مساوی قرار دیتے ہیں۔ بلاشُبہ اِس عمل میں تاحال تخریب کاری کا کوئی عنصر دریافت نہیں ہُوا۔ خراٹے بھرنے کے لئے بھی ذہنی آسُودگی ضروری ہے۔ پھر خراٹے بھرنے والے پر نیند کے عالم اور خواب کی کیفیت میں جو کُچھ گذرتی ہے اِس کی تفصیل آج تک کسی نے بیان نہیں کی تاہم چھینک کو خراٹے کے ساتھ بریکیٹ کرنا کسی طرح بھی قرینِ انصاف نہیں۔ مثال کے طور پر اِس حقیقت ہی کو دیکھئے کہ خرّاٹا سوئے ہُوئے لوگوں کا اور چھینک جاگتے لوگوں کا عمل ہے۔ بیالوجی کی رُو سے خرّاٹا گلے سے بیدار ہوتا ہے اور چھینک ناک کے راستے سے جنم لیتی ہے۔ گرامر کے اِعتبار سے خرّاٹا مذکّر ہے اور چھینک مؤنث۔ نفسیات کے زاویے سے خرّاٹا منفعل ہے اور چھینک فعال۔ سماجی نقطۂ نظر سے خرّاٹا غریب ہے اور چھینک غیور۔ ادبی زاویے سے دیکھئے تو خرّاٹا غزلِ مسلسل کی طرح طویل ہوتا ہے اور پڑوس میں سونے والوں کی نیند بھی حرام کر دیتا ہے۔ لیکن چھینک ایک سہلِ ممتنع حقیقت کا نام ہے اور اس میں وُہ بے ساختہ مُسرّت بھی موجُود ہے جو شاعر کو شعر کہہ کر اور مشرقی عورت کو بیٹا پیدا کر کے ہوتی ہے۔ چھینک غزل کے اس شعر کے

مترادف ہوتی ہے جس کا دُوسرا مصرع مُشاعرے کے سامعین اُٹھاتے ہیں اور پھر دیر تک سر دھنتے رہتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ خراٹے کا ذکر کر دینا کسی زبان کی شاعری میں موجُود نہیں لیکن چھینک کو تیسری دُنیا کی تمام قوموں نے اپنی اپنی زبانوں میں قابلِ احترام مقام دیا ہے۔ ہماری قومی زبان کے ایک بہت بڑے شاعر نے بھی فرمایا ہے کہ

آئی جو ایک چھینک تو آتی چلی گئی ہر نقش ماسوا کو مٹاتی چلی گئی

اور قابلِ فخر بات یہ ہے کہ ہماری قوم نے چھینک کو نقشِ ماسوا کو مٹانے کے لئے ہی زیادہ استعمال کیا ہے اور اب دُنیا میں دن دوگنی اور رات چوگنی ترقّی کر رہی ہے۔

دُنیا میں چھینک کی چھوٹی موٹی ہزاروں قسمیں دریافت کی جا چکی ہیں۔ ان سب میں جو فرق ہے وہ ہیئت کا فرق ہے۔ موضوعی اور معنوی طور پر سب چھینکیں ایک جیسی ہوتی ہیں اور سب کو ایک ہی زمرے میں شمار کرنا چاہیئے۔ تاہم اِس بات سے شاید انکار ممکن نہ ہو کہ فی البدیہہ چھینک کو جو عظمت حاصل ہے وُہ ناک میں مصنُوعی سرسراہٹ پیدا کر کے جبری طور پر بیدار کی گئی چھینک کو حاصل نہیں۔ اوّل الذکر تخلیقی آمد کا نتیجہ ہے اور موخر الذکر آورد کا جبری شاخسانہ۔ فی البدیہہ چھینک تو پکے ہُوئے پھل کی طرح ہوتی ہے اور اِس کے لِئے نہ تو چہرہ بگاڑنا پڑتا ہے اور نہ آنکھیں چڑھانے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ صریرِ خامہ جب ناک میں اچانک نوائے سروش پیدا کرتا ہے تو اِس قسم کی چھینک غیب سے اُترے ہوُئے مضمُون کی طرح خوُد بخُود اچانک ٹپک پڑتی ہے اور فرد کو نہ صرف آرامِ جاں فراہم کر دیتی ہے بلکہ اُس کے سر سے ایک سنگِ گراں کو بھی اُتار پھینکتی ہے۔ جاں کنی کی کیفیت تو اُس وقت پیدا ہوتی ہے جب چھینک ناک کی نالیوں میں کہیں اٹک جاتی ہے اور بغاوت کا علم بلند کر کے اخراج کی راہ نہیں دیکھتی۔ افسوس ناک بات یہ ہے کہ ڈاکٹر "س" نے اِس عرفانی لمحے کے جو فوائد گنوائے ہیں، فرد تا حال اُن سے پُوری طرح مستفید نہیں ہُوا۔ اور اِس لمحے کو ضائع کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ وہ کیمیائی ہتھیاروں سے خوُد اپنے جسم پر حملہ کرنے کے لِئے فوراً نسوار کی ڈبیا کی طرف لپکتا ہے۔ ایک چُٹکی بھرتا ہے۔ پہلے دائیں نتھنے سے اور پھر بائیں نتھنے سے گہرا سانس لے کر

نسوار کا زہریلا مادہ چھینک کی نازک شریانوں میں اتارنے لگتا ہے۔ نسوار کی ڈبیا قریب نہ ہو تو وہ کاغذ کی ایک نوکیلی منجنیق بناتا ہے اور پھر اس سے ناک کی دیواروں میں نقب لگانے لگتا ہے۔ بلاشبہ یہ حیوانی حربے آموزدہ ہیں جن سے چھینک ناک کے دہانوں سے نکلنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ لیکن غور کیجئے، یہ محض جبر ہے اور اس میں فی البدیہہ چھینک جیسی تازگی اور نغمگی نہیں ہوتی۔ اس قسم کی چھینک تو اہلِ محفل کو بھی اپنی طرف متوجہ نہیں کرتی اور اس ترقّی پسند شاعری کی طرح دکھائی دیتی ہے جس کی کھوکھلی نعرہ زنی سے عوام و خواص اکتا چکے ہوں۔ میں تو فی البدیہہ چھینک کا عاشق اور دلدادہ ہوں۔ کئی دنوں سے میں اس سے محروم ملاقات ہوں۔ لہٰذا اسے والہانہ شوق سے بلانے کی تیاریاں کر رہا ہوں۔ میں نے اپنے گرم گرم بستر سے نکل کر سرد لہروں کے سمندر میں چھلانگ لگا دی ہے۔ ہیٹر کا بٹن آف کر دیا۔ لحاف اتار کر پرے پھینک دیا ہے۔ کمرے کا دروازہ کھول دیا ہے۔ کھڑکیوں کے پٹ وا کر دیئے ہیں۔ اب میرے نتھنے کھل اٹھے ہیں۔ لیجئے اس حسینۂ ناز کی سواری بھی آ رہی ہے۔ باادب، باملاحظہ، ہوشیار!

انشائیہ

پتنگیں

ڈاکٹر انور سدید

کل شام نظر اچانک اُوپر اُٹھی تو عجیب منظر سامنے تھا۔ آسمان کا چہرہ ابھی ابھی بارش نے دھو ڈالا تھا۔ دھوپ نکل آئی تھی اور شنگرفی شام نے اپنے سر پر ابھی سُرمئی آنچل نہیں ڈالا تھا۔ آسمان اور میرے درمیان ایک خلائے بسیط تھا جس میں ان گنت رنگ برنگے پرندے اٹکھیلیاں کرتے ہوئے پر افشاں تھے۔ میں نے رنگوں کی پھوار کو بکھرتا ہوا اور کرنوں کو آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے پہلے بھی دیکھا ہے اور اس کا لطف اُٹھایا ہے۔ دن بھر کی مشقت کے بعد گھر لوٹتے ہوئے پرندوں کا مطمئن نغمہ بھی میں نے سُنا ہے۔ میں نے لپکتے اندھیرے کے باطن سے شام کا پہلا تارہ نمودار ہوتے اور سانولی سلونی شام کو آہستہ آہستہ زینے سے اُترتے ہوئے بھی دیکھا ہے اور اس حقیقت کے انکشاف سے مسرت کی بے پایاں کیفیت سے ہمیشہ سرشار ہوا کہ ایک چھوٹا سا تارہ شام کی ظلمت پر کس طرح قادر آنے کی کوشش کر رہا ہے۔

لیکن آج جو منظر میرے سامنے تھا، اس کی نوعیت مختلف تھی۔

آج جو پرندے آسمان میں تیر رہے تھے، وہ بظاہر شام ہی کے پرندے تھے لیکن اُنہیں اپنے گھروں کو جانے کی جلدی نہیں تھی۔ وہ اپنی منزلِ مقصود کی طرف رواں بھی نہیں تھے۔

یُوں معلوم ہوتا تھا کہ یہ پرندے اپنا پوٹا بھر چکے ہیں اور اب فضا پر اپنا تسلط جمانے کی فکر میں ہیں۔ آج جن پرندوں پر میری نظر پڑی تھی۔ وہ ہَوا کی طرح آزاد نہیں تھے۔ بلکہ اپنا تماشا کٹھ پتلیوں کی طرح دکھا رہے تھے اور ان کٹھ پُتلیوں کو نچانے والا میری آنکھوں سے اوجھل تھا۔

مَیں نے دیکھا کہ سبز رنگ کا ایک پرندہ اچانک زمین کی کوکھ سے برآمد ہُوا اور مشرق وشمال میں دو چار زقندیں بھرنے کے بعد اپنے ایک پڑوسی کے ساتھ چونچیں لڑانے لگا۔ میں نے سمجھا یہ معانقہ ویسا ہی ہے، جیسے بھاٹی دروازے کے اندرون رہنے والے دو بے تکلف دوست اچانک مُلاقات پر کرتے ہیں اور کُچھ پتا نہیں چلتا کہ وہ آپس لڑ رہے ہیں یا مُحبّت کا اظہار کر رہے ہیں ناگاہ میں نے دیکھا کہ فضا میں ایک خلفشار سا بپا ہو گیا۔ ایک سبز رنگ پرندہ لپکا اور سُرخ رنگ کے پرندے کے ساتھ پنجہ آزما ہو گیا۔ میرا خیال تھا کہ اب لہُو کے چھینٹے فضا سے برسیں گے اور میری دھرتی جو، ان پرندوں کی عین زد میں تھی، خُون سے لالہ زار ہو جائے گی۔ لیکن صاحب عجیب تماشا ہُوا۔ دونوں پرند ایک دُوسرے پر پھرتی سے جھپٹے۔ دونوں کی چونچیں ایک دفعہ آپس میں لڑیں اور پھر چشم زدن میں ان کے درمیان فاصلہ بڑھنے لگا۔ سُرخ پرندہ آہستہ آہستہ شمال مشرقی سمت میں سرکتا جا رہا تھا۔ سبز پرندے کے پر کا زاویہ ذرا مختلف تھا۔ لیکن پرواز کی غالب سمت وہی تھی۔ پھر یُوں ہُوا کہ سبز پرندے کو جیسے اچانک پلٹنے کا خیال آ گیا۔ وہ برق رفتاری سے اُلٹے پاؤں مُڑا اِسی لمحے سُرخ پرندے کی شہ رگ کٹ گئی اور اُس کا بریدہ سر ہَوا میں ڈھلنے لگا۔ اور وہ سر بریدہ بے دست وپا اس سمت میں لڑھکنے لگا، جدھر ہَوا اسے بہلائے لِئے جا رہی تھی۔

عین اُس وقت پُوری کائنات میں ایک شور سا بپا ہو گیا۔ وُہ کاٹا۔ وہ کاٹا کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ اِن صداؤں میں فتح و کامرانی کا غیر معمولی جوش شامل تھا۔ پھر میں نے دیکھا کہ بچوں کا ایک جمِ غفیر اُس سمت میں دوڑ رہا تھا۔ جدھر ہَوا سُرخ پرندے کو اُڑا کر لے جا رہی تھی۔ شاید فاتح فوج مالِ غنیمت کی لُوٹ کر رہی تھی۔ لیکن بچے واپس مڑے تو اُن کے چہرے اُترے ہُوئے تھے۔ مالِ غنیمت پر کوئی کامیاب ہاتھ نہ ڈال سکا تھا۔ قبائے خواجہ پھٹ گئی تھی تو

ردائے بانو بھی چاک چاک تھی۔ کسی نے اپنے ہاتھ میں کاغذ کا پھٹا ہوا ٹکڑا تھام رکھا تھا۔ کوئی تیز دھار تاگے کو لپیٹ رہا تھا اور کوئی بانس کی اُن کھپچیوں کو سنبھال رہا تھا جن میں چند لمحے پہلے سُرخ پرندے کا خونِ گرم دوڑ رہا تھا۔

یہ منظر دیدنی تھا لیکن یہ صرف ایک لمحے تک محدود نہیں تھا کہ میں اِس کی بازیافت کے لیے منظر کو اپنے لاشعور کے خزینے میں محفوظ کر لیتا۔ میں نے دیکھا کہ جنگ و جدل کا یہ منظر بار بار اُبھرتا اور پھر معدوم ہو جاتا۔ محلّے کے بچے ابھی اپنے محفوظ مستقر پر واپس نہیں آئے تھے کہ کوئی زرد رنگ پرند نیلگوں پرندے پر حملہ آور ہو جاتا۔ دُوسری جانب کوئی اُودا پرند جامنی رنگ کے پنچھی سے اور گلابی پرند چپیلے پرند سے نبرد آزما ہونے لگتا اور فضا ہمہ اقسام آوازوں سے ہر جھپٹ پر معمور ہو جاتی

موسم جب اپنے کپڑے تبدیل کرتا ہے اور جاتے جاڑے اپنا گھر آنے والی گرمیوں کے لیے خالی کر دیتے ہیں تو آسمان میں رنگ برنگی پتنگیں اُڑنے لگتی ہیں۔ پتنگیں گویا جاتے ہوئے موسم سرما کو پنکھ ہلا ہلا کر الوداع کہتی ہیں۔ لیکن مجھے تو اُن کا اندازہ ہمیشہ خیر مقدمی سا لگا ہے۔ جیسے ننھے منّے خُوش رنگ فرشتے نئے موسم کو آسمانوں سے زمین پہ لانے کے لیے سرگرم عمل ہیں۔ اِنسان کو جاڑے کی قید سے رہا ہوتے اور آزاد کھُلے موسم میں سانس لینے کی نوید دے رہے ہیں۔ خوبی کی بات یہ ہے کہ فطرت بھی ان کے احساسات کی شناسا ہے اور ان کے جذبات کی قدر کرتی ہے۔ جونہی پتنگیں آسمان میں اُبھرتی ہیں، جاڑے کو اپنا رختِ سفر باندھنے کا حُکم دے دیا جاتا ہے۔ صحنِ چمن میں بہار اُتار دی جاتی ہے، خزاں کا مُرجھایا ہُوا چہرہ تبدیل ہو جاتا ہے۔ درخت برگ و بار لانے لگتے ہیں۔ رنگ برنگے پھُول کھِل اُٹھتے ہیں۔ احساس ہونے لگتا ہے کہ کائنات اپنا پُرانا چولا بدلنے لگی ہے۔ لوگ باگ اپنے گرم ملبوسات کو دُھوپ دکھا کر صندوقوں میں بند کر دینا شروع کر دیتے ہیں۔ آتشدان میں جلتے ہُوئے کوئلوں کو بُجھا دیا جاتا ہے۔ کمروں کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔ دیوار کے بند روزنوں سے کھڑکیاں برآمد ہو جاتی ہیں اور ہم سُوکھی گھاس پہ کھِلتے ہوئے پھُولوں کا اور روپہلی کرنوں کے ساتھ ڈولتی ہُوئی پتنگوں کا نظارہ کرنے لگتے ہیں۔ جیون کے انمول خزانوں

کے مُنہ کھل جاتے ہیں۔ چنچل غم سمٹ جاتے ہیں۔ شوخ خُوشیاں پر فشاں ہو جاتی ہیں۔

اور پھر اچانک بسنت آجاتا ہے۔

بسنت پتنگوں کا تہوار ہے۔ بلاشبہ آسمان میں اُڑتی ہُوئی پتنگیں موسم کی تبدیلی کا پتا دیتی ہیں۔ لیکن اِس موسم میں زمین کی طرف نظر دوڑائیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے بہار نے اپنی رنگین قبا اُتار کر پیلی چادر اوڑھ لی اور درمیان سے سبز چار دیواری ہٹ گئی ہو۔ مُجھے سُرخ، سبز اور نیلا رنگ بھی دلکش لگتا ہے لیکن جب بسنت میں سرسوں کھلتی ہے اور حدِّ نظر تک پیلے رنگ کی بادشاہت قائم ہو جاتی ہے تو یُوں لگتا ہے جیسے پیلا رنگ ہی دُنیا کا حسین ترین اور فطرت کا اصلی رنگ ہے۔ سُرخ رنگ پر نظر پڑتے ہی حفاظتِ خُود اختیاری کے تحت آپ کے اعصاب اکڑ جاتے ہیں۔ دورانِ خُون تیز ہو جاتا ہے اور مدافعت لازم ہو جاتی ہے۔ نیلے رنگ میں گھمبیرتا بھی اور وُسعت بھی۔ یہ رنگ پھیلتے پھیلتے ایک عالم گیر چھتری بن جاتا ہے اور آپ کی پُوری شخصیت کو جذب کر لیتا ہے۔ سبز رنگ میں بلاشُبہ اپنائیت زیادہ ہے۔ اِس میں خنکی اور ٹھنڈک بھی ہے۔ لیکن یہ رنگ تو اپنی انفرادیّت ہی نہیں رکھتا۔ اِس کی صُورت گری تو نیلے اور پیلے رنگ کے امتزاج سے ہُوئی۔ کبھی سرسوں کی طرح زمین پر بچھ جاتا ہے۔ کبھی بادل کی طرح آسمان پر محیط ہو جاتا ہے۔ پیلا رنگ تو شکتی اور شانتی کا مظہر ہے۔ مہاتما بُدھ کی طرح شانت اور مطمئن۔ کھلی ہُوئی سرسوں اِس کا وجُودی پیکر ہے۔ قریب آکر دیکھئے تو یہ وجُود لاکھوں کروڑوں پھُولوں میں بٹا ہُوا نظر آتا ہے۔ دُور سے دیکھئے تو یُوں لگتا ہے۔ جیسے سطحِ زمین پر ایک ہی پھُول کھلا ہو۔ پیلے رنگ کی یہی خُوبی مجُھے اچھی لگتی ہے۔ یہ رنگ بکھرتا نہیں سمٹتا ہے۔ منقسم نہیں کرتا مجتمع کرتا ہے۔

چُنانچہ سُرخ، نیلے، سبز، سیاہ، نارنجی اور بنفشی پتنگوں میں میری نظر اچانک پیلے رنگ کے پتنگ پر پڑ جاتی ہے تو میں کھل اُٹھتا ہُوں۔ یُوں لگتا ہے جیسے زرد زرخیز زمین نے آسمان کی طرف پرواز شرُوع کر دی ہے اور اب یہ کسی بھی لمحے زمین کے مدار سے نکل جائے گی اور تسخیرِ کائنات کا عمل مکمل ہو جائے گا۔

لیکن یہ تو بس میرا خیال ہی ہے۔ اسی لمحے جب ماہر پتنگ باز ڈور سے بندھی ہُوئی پتنگ کو اپنی کمیں گاہ کی طرف کھینچ لیتا ہے تو مُجھ پر یہ حقیقت کھُلتی ہے اس نظامِ شمسی میں اصل حقیقت تو زمین ہے، جس پر آباد اِنسان نے کائنات کی پتنگ کو اپنے فکر و خیال کی ڈور سے باندھ رکھا ہے۔ اسے ڈھیل دیتا ہے تو یہ کرۂ ارض اٹھکیلیاں کرنے لگتا ہے۔ ڈور کو کھینچتا ہے تو یہ مغلوب الغضب ہو کر غرّانے لگتا ہے۔ کبھی بجلی بن کر کڑکتا ہے۔ کبھی برکھا بن کر برس جاتا ہے۔ لیکن اِنسان کسی بات کا بھی بُرا نہیں مناتا۔ زمین کے ہر رنگ پر جی جان سے نِثار ہوتا چلا جاتا ہے۔ وہ محبت سے مُسکرائے یا غصّے میں غرّائے، اُس کی ڈور تھامے رکھتا ہے اور اپنے حکمرانی کے حق سے دستبردار نہیں ہوتا۔

ڈور کو ڈھیل دینا یا کھینچنا بظاہر دو مختلف عمل ہیں۔ لیکن مجھے تو یہ ایک ہی سکّے کے دو رُخ نظر آتے ہیں اور ان سے ہی زندگی کی ایک بامعنی ثنویت مرتب ہوتی ہے۔ سچ پُوچھئے تو مُجھے زندگی بھی پتنگ ہی کے مماثل معلوم ہوتی ہے۔ ڈھیل دیجئے تو اطراف و جوانب میں بے محابا بڑھتی چلی جاتی ہے اور امنِ عالم تک کو خطرے میں ڈال دیتی ہے۔ واقعات و حوادث کی آندھی چلنے لگے تو بے مرکز زندگی کو اپنے ساتھ بہالے جاتی ہے۔ لیکن معاشرے کی ڈور مضبوط ہو اور اس پر اقدار کی گرفت کڑی ہو تو پھر بے راہ روی کا خطرہ نہیں رہتا اور موزوں مقام پر ڈور کھینچ لینے سے زندگی کو تہذیب کے مدار میں لانا ناممکن ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تہذیب یافتہ قومیں فرد کو پتنگ کی طرح فضا میں اُڑنے کا موقع تو دیتی ہیں لیکن معاشرے کے نظم و ضبط کو برقرار رکھنے کے لئے اُنہیں تہذیب کے مضبُوط تاگے سے باندھے رکھتی ہیں۔ اِنسان پتنگ ہے تو اقدار اس پتنگ کو گرفت میں رکھنے والے تاگے ہیں۔ یہ نہ ہوں تو انسانی معاشرہ اِنتشار کا شکار ہو جائے اور اِنسان کٹی ہُوئی پتنگ کی طرح بھٹکنے لگے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ تتلیاں بھی اُڑتی ہُوئی پتنگیں ہیں۔ میں اِختلافِ رائے سے اِس تشبیہ کے حُسن کو ضائع نہیں کرنا چاہتا لیکن میں تتلیوں کو پتنگوں کے مماثل قرار دینا بھی مناسب خیال نہیں کرتا۔ تتلی کی پرواز اور پتنگ کی اُڑان میں قدرِ امتیاز نُمایاں ہے۔ تتلی پرندے کی

طرح ذی رُوح، آزاد اور خُود مختار ہے۔ اِس کا وجُود نامیاتی ہے۔ جس سمت میں چاہے اُڑ سکتی ہے۔ جہاں رُکنا چاہے، رُک سکتی ہے۔ اِس کی پرواز تو اِس کی داخلی افتاد پر منحصر ہے اور یہ ہمیشہ اندر کے مست بلاوے پر ہی کان دھرتی ہے۔ اِس کے برعکس پتنگ کی ہستی غیر نامیاتی ہوتی ہے۔ بے شک اِس کے دونوں پر آزاد ہوتے ہیں۔ لیکن اِس کی گردن میں تو پھندہ پڑا ہوا ہے اور پاؤں زنجیروں میں جکڑے ہُوئے ہیں نیچے ایک لمبی سی دُم لٹکی ہوئی ہے۔ جو ہلتی تو ہے لیکن ہوا کی سمت نمائی کے سوا اور کوئی کام نہیں کر سکتی۔ لیکن کتنی عجیب بات ہے کہ پابہ زنجیر ہونے کے باوجُود پتنگ کس خُوبی سے ہوا کو چیرتی ہُوئی آسمان کی طرف اُڑتی چلی جاتی ہے اور اِس کی پرواز میں اس کا غیر نامیاتی وجُود کوئی رکاوٹ نہیں ڈالتا۔ مجھے تو یہ کسی آسمان گیر صنوبر کی طرح نظر آتی ہے۔ جس نے پابندیوں میں زندگی کرنے کی خُو کر لی ہے اور گلی گلی سے محبّت بڑھانے کی بجائے ہمیشہ چاند کا مُنہ چُومنے کی کوشش کرتی ہے۔ ہوا تیز ہو تو تتلیاں سہم کر پھُولوں میں دبک جاتی ہیں۔ لیکن پتنگ کی کیفیت دُوسری ہے۔ تیز ہوا اِس کی رگوں میں خُون بن کر اُتر جاتی ہے۔ اِس کی زندگی کی نوید بن جاتی ہے۔ اِس کا غنچۂ دل کھلا دیتی ہے اور پتنگ تُرک درویشوں کی طرح والہانہ رقص کرنے لگتی ہے۔ یہ بات بھلا تتلی میں کہاں ہے؟

کہا جاتا ہے کہ مطالعہ کا حقیقی لُطف اُٹھانے کے لِئے کتابیں پڑھنے کی عادت جوانی میں ڈالنی چاہیئے۔ پتنگ اُڑانا بھی کلیتہً اکتسابِ مسرّت کا عمل ہے۔ اِس لِئے پتنگ بازی کے لِئے بھی جوانی کا زمانہ ہی بہترین زمانہ ہے۔ یُوں بھی اِس دَور میں اِنسان کے پیر زمین پر نہیں ٹِکتے۔ وہ لونا ہنم کی طرح زمین کے مدار سے نِکلنے اور نئی فضاؤں میں سانس لینے کی کوشش کرتا ہے اور زمین کا باسی ہونے کے باوجُود نُہ سپہر سے بھی پرے جانے کی آرزو کرتا ہے۔ پتنگ اُڑانے کا عمل بھی زمین سے آسمان کی طرف پرواز کرنے کا عمل ہے۔ پتنگ کی ڈور جب اِنسانی آنکھ کو اپنی گرہ میں باندھ لیتی ہے تو اِس کا عمُودی سفر آسان ہو جاتا ہے اور وہ ڈور کے آخری سِرے پر بندھی ہُوئی پتنگ کو دیکھتا دیکھتا آسمان تک پہنچ جاتا ہے۔ حتیٰ کہ جوڑی چکلی پتنگ بھی اجرامِ فلکی

ہی کا ایک نمائندہ ستارہ نظر آنے لگتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ انسان کو پتنگ کی اڑان نے ہی چاند تک پہنچنے کی راہ دکھائی ہو گی۔ اس منصوبے پر اب تک کروڑوں ڈالر خرچ ہو چکے ہوں گے۔ لیکن جو مسرّت بے مایہ اور کم قیمت سی پتنگ اڑا کر حاصل ہوتی ہے وہ چاند کی مہم سر کر لینے سے حاصل نہیں ہوتی۔ ہر چند بڑھاپے میں اعصاب کمزور اور قویٰ مضمحل ہو جاتے ہیں۔ لیکن پتنگ بازی کی عادت نوجوانی ہی میں پختہ کر لی جائے تو بڑھاپا بھی آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اس عادت سے تو اعضا مضبوط اور نظر تیز ہو جاتی ہے۔ دندانِ آز جھپٹنے کے لئے ہمہ وقت مستعد رہتے ہیں۔ خون ٹھنڈا ہونے میں آتا ہی نہیں۔ عمر ڈھل جانے کے باوجود اکتسابِ مسرّت کے اس وسیلے میں دلچسپی کم نہیں ہوتی۔ چنانچہ حکماء نے لکھا ہے کہ زندگی کی رمق کو قائم رکھنے کے لئے پتنگ بازی تیر بہدف نسخے کا کام دیتی ہے۔ پتنگ بازی انسان کی طبعی عمر کو کئی گنا زیادہ کر دیتی ہے میں نے آج تک کسی پتنگ باز کو بیماری سے مغلوب ہو کر یا بسترِ علالت پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرتے نہیں دیکھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اکثر پتنگ باز پتنگ کو ڈھیل دیتے دیتے یا ڈور کو بے محابا کھینچتے کھینچتے اتنے مگن ہو جاتے ہیں کہ چھت کی آخری منڈیر کو بھی خاطر میں نہیں لاتے اور بے خطر گلی میں کود جاتے ہیں۔ اس قسم کی خوبصورت موت کو لوگ شہادت کا درجہ دیتے ہیں۔ سو اگر آپ بھی شہادت کا درجہ پانے کے آرزومند ہیں تو آج ہی ڈور کا ایک موٹا سا گولہ خریدیئے۔ ایک خوبصورت سی پیلی پتنگ حاصل کیجیے اور اپنے مکان کی سب سے اونچی ممٹی پر چڑھ جایئے۔ پتنگیں آسمانوں پر اور شہادت زمین پر آپ کا انتظار کر رہی ہے۔

انشائیہ

کچھ ضرب المثل کی مخالفت میں

—— وزیر آغا

عام دستور تو یہ ہے کہ ادھر قیامت کا ذکر چھڑا اور اُدھر کھٹ سے بات ان کی جوانی تک جا پہنچی، لیکن کبھی کبھی یُوں بھی ہوتا ہے کہ بات جوانی کی چھڑی اور پھر گویا قیامت ہی آگئی۔

اِک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے!

"ہائے ہائے" کا اُمّید افزا اور دلکش نعرہ خاص طور پر اس لیے اہم ہے کہ اس سے جوانی کی نوعیت پر روشنی پڑتی ہے۔ پہلی صُورت میں "جوانی" اُن کی تھی اور قیامت کی جُملہ صفات اس ناچیز کو حاصل تھیں۔ دُوسری صُورت میں جوانی اپنی ہے اور قیامت کی تمام قیامت خیزیاں اُن کی ہیں۔ پہلی صُورت قدرے خطرناک ہے کہ اِس میں مُبتلا ہو کر آپ سب کُچھ کرنے پر تُل جاتے ہیں۔ لیکن دُوسری صُورت میں بات یادوں کی سرحد سے آگے نہیں جاتی۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا ہے کہ آپ اپنی چندیا پر بڑے پیار سے ہاتھ پھیرتے ہیں اور وہاں آپ کو بالوں کے نشیب و فراز کے بجائے صحرا کی چٹیل سطح کا احساس ہوتا ہے یا آپ اپنے گالوں کو تھپتھپاتے ہیں اور آپ کی ہتھیلی میں رُخسار کی نکیلی ہڈی چُبھ جاتی ہے تو آپ حسبِ قاعدہ "ہائے ہائے" کا دلفگار نعرہ لگا کر صبر و شکر کر لیتے اور پھر سے اپنی ذات کے خول میں سمٹ جاتے ہیں لیکن جوانی کا ذکر

ہمیشہ اس قدر سطحی نہیں ہوتا۔ مثلاً میرے دوست ع جب اُن ایّام کا ذکر کرتے ہیں جب آتش جوان تھا (اور حق یہ ہے کہ ان کے ہاں آتش کچھ ضرورت سے زیادہ ہی جوان تھا) تو کبھی کبھی جوانی کی لذّت کوشیوں اور جسم کی کیف سامانیوں سے دامن چھڑا کر جوانی کی آتشِ بغاوت اور گرمی گفتار کا بھی ذکر چھیڑ دیتے ہیں اور در اصل یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر وہ خلق خدا کی عام سطح سے اُوپر اُٹھ آتے ہیں۔ ع کے ہاں جوانی کے ذکر کی ابتدا عین روایتی انداز میں ہوتی ہے وہ اپنے پاؤں اُٹھا کر مونڈھے کے کنارے پر رکھ لیتے ہیں اور ہات بڑھا کر اُن پر جمی ہوئی صدیوں کی میل کو بڑی چابکدستی سے اُتارتے، "لمبی لمبی" موم بتیوں" میں ڈھالتے اور اپنے اس عمل کے ساتھ ساتھ وقت کے دبیز پردوں کو نوچ کر الگ کرتے اور ان کے نیچے سے پوٹلیوں میں بندھی ہوئی جوانی کی یادوں کو نکال کر آپ کے سامنے چُنتے چلے جاتے ہیں۔ "جوانی کے دن بھی کیا تھے۔ پتھر کی مُورتی سے بھی پیار کرنے کو جی چاہتا تھا!" خوفزدہ ہو کر چاروں طرف دیکھتے ہیں اور پھر "بڑی کڑیل جوانی تھی ہماری! جو کھاتے تھے فی الفور ہضم ہو جاتا تھا۔ آم کے موسم میں تو کپڑے اُتار کر زمین پر بیٹھ جاتے تھے اور اس قدر آم کھاتے تھے کہ گٹھلیوں کا انبار ٹھوڑی کو چھونے لگتا تھا۔" لیکن کبھی کبھی اِن روایتی باتوں کے عین درمیان وہ کوئی بڑی گہری بات بھی کہہ جاتے ہیں مثلاً کل شام اپنی جوانی کا ذکر کرتے ہوئے بے اختیار کہہ اُٹھے "واہ کیا جوانی تھی ہماری بھی! قسم لے لو جو کبھی کسی بزرگ کی نصیحت پر ہم نے عمل کیا ہو۔" ان کی اِس بات پر میں چونک پڑا۔ اور پہلی بار مجھے احساس ہُوا کہ حضرتِ ع تو خاصے ذہین آدمی ہیں اور یہ کہ اُنھیں فلسفے سے ایک فطری لگاؤ بھی ہے۔ واقعۃً "جوانی کے ایّام میں کون کسی کی سُنتا ہے! لیکن یہی "کون" جب جوانی کے لالہ زاروں کو عبور کر آتا ہے تو بڑے فخر سے اپنے سینے پر ہات رکھ کر کہتا ہے "برخوردار! ہم تو اپنے بزرگوں کی ہر بات سُنتے تھے۔ سُبحان اللہ کیا دن تھے! در اصل نصیحت کا یہ قاعدہ ہے کہ وہ ہر قسم کی رکاوٹ یا "ردِ عمل کو پسِ پُشت ڈال کر بڑی ہٹ دھرمی کے ساتھ ایک نسل سے دُوسری نسل میں منتقل ہو جاتی ہے۔ جوانی اِس خُوش فہمی میں رہتی ہے کہ اُس نے اس عارضی

کی نفی کر دی لیکن ہوتا یہ ہے کہ اِس کے جرثومے بڑی آہستگی سے اُس کے خُون میں داخل ہوتے اور وہاں بڑی خاموشی سے اپنی جڑیں مضبوط کرتے رہتے ہیں۔ اِدھر جوانی کا خُون سرد پڑا، چندیا پر سے بال اُڑے، دانتوں نے لڑکھڑا کر الوداع کہی اور اُدھر جسم کے اندر چھُپا ہُوا یہ عفریت مُونچھوں پر تاؤ دیتا ہُوا برآمد ہو گیا۔ تاریخ اپنے اوراق اُلٹتی ہے۔ نسلیں اُبھرتی اور ڈوبتی ہیں۔ افراد پیدا ہوتے اور مر جاتے ہیں لیکن نصیحت کا علم ہمیشہ بلند رہتا ہے۔ اِسے کبھی فنا نہیں۔!

نصیحت کو تو میں پھر بھی قابلِ عفو سمجھتا ہُوں، لیکن نصیحت کی بڑی بہن یعنی ضرب المثل سے مجھے چڑ ہے۔ نصیحت میں کم از کم وہ زہر خند نہیں ہوتا جو ضرب المثل سے خاص ہے۔ نصیحت کرنے والا ایک بے حد معصُوم انسان ہوتا ہے، جو نصیحت کرنے کے دوران کبھی اِس بات کو فراموش نہیں کرتا کہ اُس کا یہ عمل از سرتا پا ایک سعیٔ لاحاصل ہے۔ خُود اپنی جوانی کے ایّام میں اُس نے کب کسی کی نصیحت کو کوئی اہمیّت دی تھی کہ اب اُس کے برخوردار اسے اہمیّت دینے لگیں؟ تاہم چُونکہ رسماً اور اخلاقاً اُسے اِس عمل سے گُزرنا ہوتا ہے۔ اِس لئے با دلِ نخواستہ وہ گُزرتا ہے اور نصیحت کرنے والا سپورٹس مین شپ کا مظاہرہ کرتے ہُوئے بڑی عقیدت سے اِس نصیحت کو وصُول کر کے سرخرو ہو جاتا ہے اور بس! اس سے نہ تو آج تک نصیحت کرنے والے کو کوئی صدمہ پہنچا اور نہ نصیحت سُننے والے کو اُس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس کھیل کے دونوں اداکار کھیل کے مزاج سے واقف ہیں اور اِس سے کوئی ایسی توقّع وابستہ نہیں کرتے، جس کے فسخ ہونے پر اُنھیں کوئی صدمہ پہنچے۔ گویا نصیحت کے عمل میں نیک نیّتی، مُروّت اور روایت کا تحفّظ مقصُود ہوتا ہے اس کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہوتا کہ نصیحت اثر کرے اور نصیحت وصُول کرنے والا اس پر عمل کرنے کی حماقت کا مرتکب بھی ہو۔ نصیحت تو وزن کے ٹکٹ کی مانند ہے آپ جانتے ہیں کہ دُوسرا ٹکٹ آپ کو نہ صرف مختلف وزن بتائے گا بلکہ آپ کی تقدیر کے سِلسلے میں ہر بار مختلف قیاس آرائی کا مرتکب بھی ہوگا۔ لیکن ریل کے سفر کی روایات کے احترام میں آپ بڑی عقیدت سے لوہے کے ایک مختصر سے پلیٹ فارم پر کھڑے ہو کر اپنے وزن کا ٹکٹ حاصل کرنے کا ایک مضحکہ خیز فریضہ سرانجام دینے میں کوئی

حرج نہیں دیکھتے۔ بالکل اسی طرح کسی بزرگ کے پوپلے منہ سے نصیحت کے چند بے ضرر جملے سن لینے میں آخر کیا حرج ہے؟ مجھے وہ نوجوان ایک آنکھ نہیں بھاتے جو نصیحت کی انسٹی ٹیوشن سے عدم واقفیت کی بنا پر جھلاہٹ اور برہمی کا مظاہرہ کرتے اور نصیحتوں کی یلغار کی صورت میں اپنے بزرگوں سے اُلجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بڑے افسوس کی بات ہے! نصیحت ایک قطعاً بے ضرر اور معصوم سا عمل ہے جب کوئی کہتا ہے ع

نانک ننھے ہو رہو جیسی ننھی دوب

یا

"بیٹا" ایسی پریت کر جیسی برچھ کرے

اپنے اوپر دھوپ سہے اوروں کو چھاؤں دے"

تو اس سے یہ مراد لینا بالکل غلط ہے کہ کہنے والے نے سنجیدگی سے آپ کو مشورہ دیا کہ آپ صبح اٹھتے ہی چوراہے میں جا کر لیٹ جائیں اور جب ٹریفک کا سپاہی آپ کو اٹھانے کی کوشش کرے تو مسکرا کر ع

نانک ننھے ہو رہو جیسی ننھی دوب

کے ورد سے اس کا سواگت کریں یا پھر درختوں کی قطار میں جو جگہ آپ کو خالی نظر آئے، وہاں نقلی چوکیدار کی طرح کھڑے ہو کر اپنے سائے سے خلقِ خدا کو آرام بہم پہنچانے کی احمقانہ حرکت کے مرتکب ہوں۔ نصیحت کا جذبہ اگر واقعتاً سنجیدہ ہوتا اور برخورداروں کا قافلہ اس پر اسی سنجیدگی سے عمل پیرا ہوتا تو آج چوراہے کا سارا ٹریفک معطل اور ہفتہ شجرکاری کی ساری روایت ختم ہو گئی ہوتی۔ لیکن شکر ہے کہ ایسا نہیں ہوا اور ابھی اس جہانِ رنگ و بو میں کچھ شجرکاری اور ٹریفک باقی ہے تاہم نصیحت کا سارا عمل جذبے کی معصومانہ ذہنیت کا غماز ضرور ہے اور اسی لئے میں نصیحت کو کچھ زیادہ برا نہیں سمجھتا، لیکن ضرب المثل کے ذکر ہی سے میرا سانس رکنے لگتا ہے غور کیجئے کہ ضرب المثل کا مقصد دوسروں کا تمسخر اڑانے اور ان کی آواز کو دبانے کے علاوہ اور کیا ہے؟

ضربُ المثل کی ترکیب میں "ضرب" کا بولتا ہُوا لفظ بجائے خود اس کی تشدّد پسند ذہنیت کا غماز ہے۔ کہتے ہیں کہ جہاں خُدا نے چار الہامی کتابیں نازل کیں وہاں ایک ڈنڈا بھی اُتارا۔ ڈنڈا۔ جو ہزاروں برس کے استعمال کے بعد گھس پٹ کر "ضربُ المثل" میں ڈھل گیا۔ چنانچہ بظاہر تو ضرب المثل پھُولوں سے لدی شاخ کی مانند ہے، لیکن پھُولوں کو اُتار دیجیے تو نیچے سے ایک بے رحم ننگی چھڑی برآمد ہو جاتی ہے۔ چھڑی، جس کی مدد سے سماج کا گلہ بان ہر بھٹکی ہُوئی بھیڑ کو ہانک کر دوبارہ گلے میں شامل کر لیتا ہے۔ ضربُ المثل کا ورد کرنے والے کی آنکھوں میں جو شریری مسکراہٹ پیدا ہوتی ہے۔ اُس کے لہجے میں جو تمسخر اور تحکم جنم لیتا ہے اور اس کے الفاظ میں جو خفگی، تہدیدی انداز اور احساسِ برتری کی جھلک دکھائی دیتی ہے، مَیں تو اس کے تصوّر ہی سے کانپ اُٹھتا ہُوں۔ لوک گیت کی طرح ضرب المثل کے خالق کا بھی آج تک کسی کو حسب نسب معلوم نہیں ہو سکا۔ قیاس یہی کہتا ہے کہ جب ساون کی گھنگھور گھٹائیں اُمڈ اُمڈ کر آتی ہیں۔ پپیہے درختوں میں اور شاعر مشاعروں میں شور مچاتے ہیں جب عاشق ململ کے کُرتے کے ازلی وابدی چاک کو درزی کے مشورے سے بڑا کر لیتے ہیں اور ایکسپورٹ امپورٹ کے کاروبار میں مندے کا رجحان پھیل جاتا ہے تو شہر کے شور وغُل سے بہت دُور کسی پہاڑ کے دامن یا ندی کے کنارے یا باغ کی روش پر کوئی پیرِ فرتوت اپنے تخیّل کو مہمیز لگا کر یا اجتماعی ذہن کو ٹٹول کر ضربُ المثل کا ایک پُرانا کرم خوردہ نسخہ نکالتا ہے پھر آناً فاناً پھُول کی خوشبُو کی طرح یہ ضرب المثل چہار اطراف میں پھیل جاتی اور ہر ٹیکسی رکشا ڈرائیور کے ہونٹوں پر تھرکنے لگتی ہے۔ مَیں کہتا ہُوں یہ بُوڑھا کوئی گوشت پوست کی ہستی نہیں بلکہ سوسائٹی کا وہ "عمر رسیدہ ذہن" ہے جو فرد کی انفرادیّت کے عمل کو ہمیشہ بڑی حقارت کی نظروں سے دیکھتا رہا ہے۔

اِدھر کسی ذہین نوجوان نے تخلیقی دباؤ کے تحت کوئی نیا دھندا شرُوع کیا۔ وزن اور بحر سے بے نیاز کوئی نثری نظم لکھی، کسے کسائے لباس میں کوئی نئی پگڈنڈی اختیار کی یا خیال کا کوئی نیا پیکر تراشا اور اُدھر سوسائٹی کا بابا، ضربُ المثل کا ڈنڈا ہاتھ میں لیے آدھمکا اور نوجوان کو تمسخر، تحکم اور جراحت سے پسپا کرنے لگا۔ میں کہتا ہُوں، ضرب المثل تو وہ مائیکرو فُون ہے، جس کی مدد سے سوسائٹی

اپنی آواز کو دس گنا بڑھا کر پیش کرتی اور یُوں ان بہت سی ننھی مُنّی اور شیریں آوازوں کو دبا دیتی ہے جو اس کے پروں کے نیچے سے نکلے ہُوئے چُوزے پیدا کرتے ہیں۔

لیکن ضرب المثل کی ایک اور خصُوصیت بھی ہے، بے شک اِس کی آواز بہت بلند، پُرشکوہ اور گھمبیر ہے تاہم سوسائٹی کے عمُر رسیدہ ذہن نے اِس بات کا خاص اہتمام کیا ہے کہ یہ آواز اِس کے علاوہ مسحُور کن بھی ہو اور اِس میں ایسا نغماتی لوچ بھی ہو کہ ہر سُننے والا اِس کی طرف پروانہ وار کھنچا چلا آئے۔ چُنانچہ آپ دیکھئے کہ ہر ضرب المثل میں ایک صوتی حُسن ہوتا ہے اور اس کا شعری آہنگ اور نغماتی زیر و بم سُننے والے کی حسیات کو تھپک تھپک کر میٹھی نیند سلا دیتا ہے۔ مجُھے ذاتی طور پر تو مُرغی کی آواز نے کبھی متاثّر نہیں کیا، لیکن جب وہ ایک خاص انداز سے کڑک کڑک کا دلکش نغمہ بلند کرتی ہے تو صحن میں بکھرے ہُوئے چُوزے برق رفتاری سے لپک کے اُس کے قدموں میں جمع ہو جاتے ہیں۔ بالکل یہی حال ضرب المثل کا ہے کہ یہ سوسائٹی کے باغیوں کو ایک ایسے نغماتی زیر و بم میں اسیر کر لیتی ہے کہ وُہ کچّے دھاگے سے بندھے اس کی جانب کھنچے چلے آتے ہیں۔ چُنانچہ آپ شاید حیران ہوں کہ ضربُ المثل کی کڑک کڑک کو سُنتے ہی میری تمام فلسفیانہ موشگافیوں اور ازبر کیے ہُوئے دلائل کو گویا سانپ سونگھ جاتا ہے۔ مجُھے یُوں محسوس ہوتا ہے جیسے ضرب المثل تو ایک دلکش لوری ہے اور اِس کے ہوتے ہُوئے میری ذہنی اپج یا اضطراری کیفیّت کی نمُو کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اِسی لِئے مجُھے ضرب المثل سے چڑ ہے۔ کہ یہ میری ذات، میری انفرادیت کی نفی کر کے مجُھے انبوہ کا ایک جُزو بننے پر مجبُور کرتی ہے اور آپ جانتے ہیں، میں بھٹکی ہُوئی بھیڑ تو کہلا سکتا ہُوں، لیکن گلّے کی ایک اندھی بہری بھیڑ کا منصب مجُھے کسی صُورت بھی قبُول نہیں۔ کیا آپ کو قبُول ہے؟

انشائیہ

آنکھیں

—— وزیر آغا

وہ اندھا فقیر جو صُبح سویرے، گلی میں سے گُذرتے ہُوئے آنکھوں والوں کو بینائی کے چھِن جانے کا خوف باآواز بلند دلاتا ہے۔ در اصل اعصابی جنگ کا ایک بہت بڑا ماہر ہے۔ وہ جانتا ہے کہ بینائی خَلقِ خُدا کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ بینائی چھِن جائے تو پھر چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے اور اندھیرا چاہے وہ گہرے غار کا ہو یا گھنے جنگل کا یا تاریک قبر کا، بہرحال ایک دہشت ناک شے ہے۔ اندھا فقیر آنکھوں والوں کی اِس کمزوری سے واقف ہے۔ مگر وہ دِل ہی دِل میں اس نام نہاد کمزوری کی ماہیّت سے بھی آگاہ ہے اور اس پر مُسکرانے کی صلاحیّت سے بھی بہرہ ور ہے کیونکہ اُسے معلوم ہے کہ مطلق اندھیرا ایک بے معنی بات ہے۔ گہرے سے گہرے اندھیرے کی بھی ایک اپنی روشنی ہوتی ہے۔ جب بصارت کا چراغ گُل ہوتا ہے تو بصیرت کی قندیل روشن ہو جاتی ہے۔ ویسے بھی اندھیرے کی اوّلین یلغار آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے مگر کچھ ہی عرصہ کے بعد اندھیرے کی کوکھ میں لکیریں سی کلبلانے لگتی ہیں۔ نقوش اُبھر آتے ہیں۔ کرنیں ناچنے لگتی ہیں۔ اندھیرے کی یہ روشنی، اُجالے کی روشنی سے مختلف نوعیّت کی ہے۔ اُجالے کی روشنی تو بڑی ظالم چیز ہے جو اشیا۔ کو بالکل ننگا کر دیتی ہے۔ چہرہ ہی نہیں رُوح تک کے داغ

دھبے اُبھر آتے ہیں۔ دُوسری طرف اندھیرے کی روشنی میں سیدھی بے مہر لکیریں بھی نازک سی قوسوں کے رُوپ میں نظر آنے لگتی ہیں نشیب و فراز کا فرق ملائم ہو جاتا ہے۔ حقیقت کی کرختگی خواب کی ختگی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اُجالے کی روشنی میں سائنس، فلسفہ اور شماریات کو فروغ ملتا ہے۔ اندھیرے کی روشنی میں فنونِ لطیفہ کے بیج اُگتے ہیں۔ اندھے فقیر کو یہ سب باتیں معلوم ہیں مگر چُونکہ وہ جانتا ہے کہ آپ اندھیرے کی برکات سے ناواقف ہیں اور اندھیرے کا نام سُنتے ہی ایک نسلی اور اعصابی خوف میں مُبتلا ہو جائیں گے۔ اِس لِئے وُہ آپ کی کور نگاہی پر فرطِ مسرت سے ایک نعرۂ مستانہ لگاتا ہے۔ اور آپ کو اپنے پھیلائے ہُوئے دام میں بآسانی گرفتار کر لیتا ہے۔ شاباش ہے!

آنکھیں محض دیکھنے کی نہیں دکھانے کی بھی چیز ہیں۔ بعض آنکھیں اُن کھڑکیوں کی طرح ہوتی ہیں جن پر رنگدار چقیں لٹک رہی ہوں۔ کوئی جب ان چقوں کو درزوں سے جھانکتا ہے تو نیچے گلی میں باادب باملاحظہ کھڑے نوجوانوں کی سانسیں ناہموار ہو جاتی ہیں اور شریانوں میں لہُو کا طُوفان آ جاتا ہے ـــــ بعض آنکھیں بالکل ننگی ہوتی ہیں، دُھلی دُھلاتی ہر قسم کے لبادے سے بے نیاز ایسی آنکھیں، آنکھیں نہیں ایکسرے (شعاعیں) ہیں۔ آپ ان کے راستے میں ہزار بند باندھیں، دیواریں کھڑی کریں۔ آپ ان کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتے۔ اِس لِئے اِن پر بال ہوتا ہی نہیں ہے۔ وہ تو ایک سُرخ آہنی سلاخ کی صُورت خانۂ چشم سے باہر آتی ہیں اور آپ کے بدن ہی کو نہیں پُوری شخصیّت کو چھید ڈالتی ہیں۔ ہٹلر اور نیپولین اور نادر شاہ کے بارے میں سُنا ہے کہ ان کی آنکھیں اسی نوعیّت کی تھیں کوئی اُن کی آنکھوں کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا تھا ـــــ بعض لوگ اپنی جسمانی قوّت سے دُوسروں کو زیر کرتے ہیں، بعض آواز کی گھمبیرتا، رعب اور کرختگی سے فریقِ مخالف کو زمین بوس ہونے پر مجبُور کرتے ہیں اور بعض تیز زوردار پھُونکوں سے دُوسروں کے چراغ گُل کر دینا چاہتے ہیں۔ مگر یہ سب ہتھیار آنکھوں کی قوّت اور جبروت کے سامنے بالکل ہیچ ہیں ـــــ تاہم ساری آنکھیں تو دُوسروں کی شخصیّت کو زیر پا

لانے پر مامور نہیں ایسی آنکھیں بھی ہیں جو مزاج یا موڈ کی لاتعداد کروٹوں کا منظر ہمہ وقت دکھاتی ہیں۔ ان کی حیثیت گرگٹ کی سی ہے پل میں کچھ، پل میں کچھ! ابھی ان میں شرارت کھڑی مسکرا رہی تھی اور اب نفرت کٹار باندھے آکھڑی ہوئی ہے۔ ابھی ذہانت کا لشکارا دکھائی دیا تھا اور اب حماقت ڈان کہوٹے کے اسپ آہستہ خرام پر سوار نظروں کے سامنے سے گذر رہی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے آنکھوں کے پردوں پر پتلیوں کا کھیل ہو رہا ہو۔ آنکھ کو آپ آئینے سے بھی تشبیہہ دے سکتے ہیں۔ مگر نہیں! آئینے میں تو صرف باہر کی چیزیں منعکس ہوتی ہیں۔ آنکھ تو جام جہاں نما کی طرح ہے کہ اس میں لمحہ بہ لمحہ نئے سے نئے عکس پیدا ہو رہے ہوتے ہیں۔ یہ سارے عکس باہر سے آئے ہوئے چمکدار ریزوں یا آبدار شعاعوں سے مرتب نہیں ہوتے بلکہ از خود اندر کے "ناموجود" سے ابھرتے ہیں۔ کئی بار میں نے سوچا ہے کہ شاید ابتدا میں صرف "آنکھ" تھی — ایک بے کنار، محیط و بسیط آنکھ جو خلا کو گھور رہی تھی۔ پھر اچانک اس آنکھ کے اندر عکسوں کا ایک لامتناہی سلسلہ موجزن ہو گیا۔ کچھ زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا کہ عکسوں کا یہ سمندر، آنسوؤں میں ڈھل کر اپنے کناروں سے چھلک گیا اور پھر لاتعداد ستاروں اور سیاروں اور کہکشاؤں کی صورت بساطِ فلک پر چمکنے لگا۔ تب آنکھ نے اسے دیکھا، مسکرائی اور کہا۔ "اچھا ہے"[1]!

آنکھوں کی شان میں بڑی شاندار باتیں کہی گئی ہیں۔ م۔ ا کہ شاعر تھے آنکھوں کو آئینے پر رکھے دو خاک کے کھلونوں سے تشبیہہ دیا کرتے تھے۔ آخری عمر میں جب گوشہ نشین ہو گئے اور بینائی بھی کمزور ہو گئی تو کہا کرتے تھے کہ آنکھیں روزنِ ادراک کے پردے ہیں۔ گویا وہ اب آنکھوں کو انکشاف کا نہیں بلکہ اخفا کا ذریعہ سمجھنے لگے تھے۔ مگر میرا خیال ہے کہ م۔ ا کی اس بات میں آدھی سچائی تھی۔ کیونکہ آنکھیں چھپاتی تو ہیں مگر ساتھ ہی منکشف بھی کرتی ہیں چھپانے کے لئے آنکھوں نے شرم و حیا کی خدمات حاصل کر رکھی ہیں۔ ادھر آپ نے کسی لمحۂ خود فراموشی میں پیار بھری نظروں سے کسی کی طرف دیکھا اور ادھر اس جانِ حیا نے لجا کر آنکھوں کے پردے

۱۔ بحوالہ "عہد نامۂ قدیم"

گرا دیئے اور لاجونتی کی طرح سمٹ کر چادر اور چار دیواری میں محبوس ہو گئی، جیسے کہہ رہی ہو کہ میں اتنی نازک اور اَن چھوئی ہوں کہ بیباک نظروں کے لمس کی بھی متحمل نہیں ہو سکتی ——— مگر اخفا کا دُوسرا پہلو "آنکھ چرانے" کے ذیل میں آتا ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ آپ جب نقب لگا کر فریقِ مخالف کے دل میں اُترتے ہیں۔ جہاں موصوف کے اندر کی ساری خباثت اور منافقت کھلے مُنہ، سرِ بازار بیٹھی ہوتی ہے اور فریقِ مخالف کو بھی اِطلاع ہو جاتی کہ موصوف کی چوری پکڑی گئی ہے تو اُس کے لِئے یہ ممکن نہیں رہتا کہ آپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ سکے۔ سو وہ آنکھ چرانے کا مرتکب ہوتا ہے۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے کے لئے بلا کی خُود اعتمادی درکار ہے۔ جہاں یہ صفت موجُود نہ ہو وہاں آنکھیں چرائے بغیر چارہ نہیں ہے۔

مگر آنکھیں اِخفا کے عِلاوہ انکشاف کا ذریعہ بھی تو ہیں۔ میں جب کبھی اپنے لڑکپن کی یادوں کو کریدتا ہوں تو مجھے اپنے ایک بزرگ تخت پوش پر لیٹے ہُوئے دکھائی دیتے ہیں۔ میں اُنہیں دس برس تک اسی ایک تخت پوش پر بے حس و حرکت لیٹے ہُوئے دیکھتا رہا۔ اِن پر فالج گرا تھا اور اُن کا سارا جسم پُوری طرح مفلوج ہو گیا تھا البتہ ان کی آنکھیں زندہ اور فعال تھیں۔ انہیں جو کچھ کہنا ہوتا اپنی آنکھوں کی پُتلیوں کی مدد سے کہتے۔ ان کی آنکھوں کی "زبان" کو صِرف ان کی ایک پوتی سمجھتی تھی وہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتی جہاں دو گول سی پُتلیاں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اُوپر نیچے اور دائیں بائیں حرکت کر رہی ہوتیں اور پھر فر فر اُن کی بات گھر والوں کو بتا دیتی۔ میرے اِس بزرگ کا جسم تو مفلوج تھا مگر شاید تلافی کے طور پر ان کی آنکھوں کی قوّتِ گویائی اس قدر بڑھ گئی تھی کہ اس پر تکلّم کی ہزار نیرنگیوں کو بآسانی قربان کیا جا سکتا تھا۔ مگر آنکھیں قریب ہی سے نہیں فاصلے سے بھی گفتگو کر سکتی ہیں۔ مثلاً بعض اوقات ظالم سماج دو پریمیوں کے درمیان کسی گہرے اور کُشادہ دریا کی طرح آن کھڑا ہوتا ہے۔ اس وقت فراق زدہ پیاسی آنکھیں کچّے گھڑے میں منتقل ہو کر دریا کو پار کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ مگر کر نہیں پاتیں۔ تب ان کے پردوں سے ایک ایسی صدائے بے آواز بلند ہوتی ہے جسے

صرف دریا کے دُوسرے کنارے پر چمکتی ہُوئی منتظر آنکھوں کا ٹیلی پرنٹر ہی وصول کر سکتا ہے ـــــ انسانی ارتقاء میں تکلّم نے بعد میں جنم لیا۔ اِس سے پہلے اشاروں کنایوں کی زبان رائج تھی۔ مگر ان دونوں سے پہلے آنکھوں نے بولنا سیکھ لیا تھا۔ آنکھ سے بڑا زبان دان آج تک پیدا نہیں ہُوا۔ جو لوگ پلکوں اور گلابی ڈوروں کو ہیروغلیفی تحریر (HIEROGLYPH) کو پڑھنے میں مہارت رکھتے ہیں وہی دراصل آنکھ کی زبان کو سمجھنے پر قادر ہیں۔ کسی اور کو یہ سعادت کبھی حاصل نہیں ہو سکتی!

رنگ رُوپ اور تراش خراش کے اعتبار سے تو آنکھوں کے کئی "گھرانے" ہیں لیکن کارکردگی کے اعتبار سے آنکھیں صِرف دو طرح کی ہیں ـــــ خُوردبین آنکھیں اور دُوربین آنکھیں! خُوردبین آنکھوں کی زد RANGE محدُود ہے۔ وہ صِرف قریب ترین اشیاء ہی کو نظر کی گرفت میں لیتی ہیں۔ مقاصد کی فوری تکمیل ان کا مطمحِ نظر ہے۔ یہ آنکھیں تخیل پر حقیقت کو، مسرت پر لذت کو اور دولتِ بیدار پر دولتِ دینار کو ترجیح دیتی ہیں۔ یہ آنکھیں اُن ایام کی یادگار ہیں جب حضرتِ انسان کے لئے ایک شاخ سے دُوسری شاخ کی طرف چھلانگ لگاتے وقت نظر کی مدد سے شاخوں کے درمیان فاصلے کی پیمائش کر لینا بہت ضروری تھا۔ ساتھ ہی جب یہ بھی ضروری تھا کہ شاخ کے رنگ کو شاخ سے لٹکے ہُوئے پھل کے رنگ سے ممیز کیا جا سکے۔ چُنانچہ ایسی آنکھوں کی تحویل میں فاصلے کو ماپنے اور رنگ کو پہچاننے کی یہ دونوں صفات آ گئیں۔ آج جب اہلِ نظر کالی گوری، زرد اور مٹیالی قوموں کو رنگت کی بنا پر ایک دُوسری سے الگ کر کے اپنے تعصّبات کو پالتے پوستے ہیں۔ یا جب مکان کی اینٹ، رُوپے کی جھنکار، اور بدن کی خُوشبو کو سمیٹ لینا چاہتے ہیں تو دراصل اپنی خوردبین آنکھوں ہی کو مصرف میں لا رہے ہوتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں دُوربین آنکھیں ہیں جو جسموں اور دیواروں کو عبُور کر کے زمین اور آسمان کی ملتی ہُوئی سرحدوں کو اپنے پیاسے ہونٹوں سے چھُوتی ہیں اور ایک ہی پل میں کروڑوں روشنی کے سالوں کا فاصلہ طے کر کے ستاروں تک کو نظر کی مٹھی میں بند کر لیتی ہیں۔ ایسی آنکھیں زیادہ تر خواب ہی دیکھتی ہیں متخیلہ ان کا ہتھیار ہے وسعت طلبی ان کا موقف اور آوارہ خرامی ان کا مسلک ـــــ شاعروں اور

صُوفیوں کو قدرت نے اُنہیں آنکھوں سے نوازا ہے۔

لیکن وُہ لوگ بھی جنہیں قدرت نے اس قسم کی آنکھوں سے محروم رکھا ہے اِس بات سے توبہرحال واقف ہوں گے کہ یہ کرۂ ارض جس پر وہ آج آلتی پالتی مارے بیٹھے ہیں۔ آج سے تقریباً ساڑھے چار ارب سال پہلے وجُود میں آیا تھا۔ اس وقت یہ چٹیل تھا۔ بے آب و گیاہ تھا۔ بالکل اس معصُوم سی چندھیا کی طرح جس پر ابھی بال و پر نمُودار نہ ہُوئے ہوں۔ پھر آج سے تقریباً دو ارب سال پہلے اِس کرۂ ارض پر ایک پُراسرار ہستی دبے پاؤں اُتری اور اُترتے ہی اس کی سطح سے چپک گئی۔ اُس وقت وہ اندھی بھی تھی اور بہری بھی۔ البتہ محسوس کر سکتی تھی کافی عرصہ تک وُہ ڈری ہوُئی گُم صُم زمین کے سینے سے چمٹی رہی۔ پھر ایک روز اُس نے گردوپیش کو اپنے سوّیوں ایسے لمبے لمبے ہاتھوں سے ٹٹولنا شرُوع کیا۔ اس وقت یہ ہاتھ ہی اس کی آنکھیں تھیں۔ اس کے بعد اس نے رُک کر اپنی نئی نویلی قوت سماعت کی مدد سے اِرد گرد کی آوازوں کو سُننا شروع کیا جیسے یہ جاننا چاہتی ہو کہ اس کرۂ ارض پر اُس کے عِلاوہ کوئی اور ذی رُوح تو نہیں ہے۔ مگر اُس کے چاروں طرف ہواؤں، سمندروں، زلزلوں اور آتش فشاں پہاڑوں کی آوازوں کا تو محشر بپا تھا۔ لیکن اُس جیسی کسی ہستی کی چاپ بالکل نہیں تھی۔ تب اس نے حوصلہ پاکر اس کرۂ ارض پر گھُومنا پھرنا شرُوع کیا پہلے تو وہ اشیا کو ٹٹول ٹٹول کر چلی مگر پھر اس نے جہان رنگ و نور کا تماشا کرنے کے لِئے اپنے اندر سے دو لالٹینیں برآمد کیں۔ یہ آنکھوں کی ابتدا تھی زندگی کو یہ لالٹینیں اتنی اچھی لگیں کہ اس نے انہیں بڑے پیمانے پر بنانے کا منصُوبہ بنا لیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے آنکھوں کی تعداد بڑھتی ہی چلی گئی۔ مچھلیاں، تتلیاں، مکھیاں، رینگنے والی مخلوق، پرندے، چوپائے، اور انسان۔ ان سب نے یہ نیا فیشن اپنا لیا۔ بعض نے اپنے لئے بلیک اینڈ وائٹ بصارت کو پسند کیا۔ بعض نے رنگین آنکھیں لگا لیں۔ بعض نے دو ابعادی اور بعض نے سہ ابعادی آنکھیں پسند کیں۔ اب گویا آنکھیں ہی اس کرۂ ارض کا نیا فیشن تھا جو دم بہ دم مقبول ہو رہا تھا۔ کئی بار مَیں نے خُود سے پُوچھا ہے کہ آخر "زندگی" کو آنکھوں کی ضرورت ہی کیوں پڑی؟ کیا ماحول

تک رسائی پانے کے لیے دُوسری حسیات ناکافی تھیں کہ اس نے باصرہ کے حصُول کو ضروری سمجھا؟
——— یقیناً ایسی ہی کوئی بات ہوگی۔ مگر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ "زندگی" کے ہاں یہ خواہش پیدا ہُوئی کہ وہ دُوسروں کے علاوہ اپنا بھی نظّارہ کرے اور اُس نے اپنے اندر سے ایک ایسا آلہ نکال لیا جو یہ کام بخوبی سرانجام دے سکتا تھا۔ میں جب اپنے چاروں طرف اِنسانوں، پرندوں اور چوپایوں کو آنکھیں جھپکتے ہُوئے دیکھتا ہُوں تو مجُھے یُوں لگتا ہے جیسے ان کروڑوں اربوں آنکھوں سے وہی "پُراسرار ہستی" جھانک رہی ہے۔ جس نے قرنوں پہلے ڈرتے ڈرتے اِس کرۂ ارض پر قدم رکھا تھا مگر جو اَب اتنی نڈر اور بیباک ہوگئی ہے کہ کھُلے بندوں نہ صِرف ارض و سما کو گھور رہی ہے بلکہ اپنے آپ کو بھی دیکھنے لگی ہے۔ اس پُراسرار ہستی کی آنکھوں میں ایک عجیب سی شرارت آمیز چمک ہے یُوں لگتا ہے جیسے وُہ اندھے فقیر کی طرح سب کچُھ جان گئی ہو اور اَب بآوازِ بلند تمسخر اُڑا رہی ہو۔ سوال صِرف یہ ہے کہ وہ کس کا تمسخر اُڑا رہی ہے؟؟۔

"مقطع"

ڈاکٹر ذوالفقار علی ملک

وائس چانسلر۔ اسلامیہ یونیورسٹی

شعبۂ اُردو و اقبالیات، اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور وقتاً فوقتاً ادبی تقریبات کا انعقاد کرتا رہتا ہے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے۔ گذشتہ برس بھی شعبۂ اُردو کی طرف سے تین سیمیناروں کا بندوبست کیا گیا تھا۔ لیکن اِس مرتبہ موضوع میں ادب دوست حضرات کی دلچسپی کی وجہ سے سیمینار کا دائرہ کسی قدر بڑھا دیا گیا۔

اِنشائیہ ہمارے ادب کی ایک اِنتہائی متنازعہ صنفِ ادب ہے اور اِس کی تنقید و تحسین کے سلسلے میں باقاعدہ طور پر دو دبستان معرضِ وجود میں آچکے ہیں لیکن ہم ہر دو دبستانوں کی اہمیت و افادیت کو تسلیم کرنے کے باوجود یہ سمجھتے تھے کہ اِنشائیہ سیمینار میں کسی ایک دبستان کے نمائندہ ناقدین کی شرکت خاطر خواہ نتائج پیدا نہیں کرے گی۔ لہٰذا کوشش کی گئی کہ ہر دبستان کے نمائندہ ناقدین کو زحمت دی جائے کہ وہ صنفِ اِنشائیہ اور اِس سے متعلقہ مباحث پر اظہارِ خیال فرمائیں۔ مجھے خوشی ہے کہ ہماری درخواست پر لاہور اور سرگودھا یعنی دونوں دبستانوں کے اہم ترین نقاد تشریف لائے اور اُنہوں نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ یقین کیجیے کہ ہم نے ڈاکٹر وزیر آغا کو بُلانے کی بھی بے حد کوشش کی اُن کے مسلسل انکار کے باوجود ہم

مایوس نہیں ہوئے۔ آخر کار انھوں نے ہمارے شوق اور انتظار کی شدت کا اندازہ کر کے یہاں تشریف لانے کی حامی بھی بھر لی لیکن یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ وہ عین وقت پر علیل ہو گئے۔ ورنہ آج آپ ادبی ستاروں کے اس جھرمٹ میں اُن کی تابناکی کا نظارہ بھی کر رہے ہوتے۔

ہم نے کوشش کی کہ جہاں دُوسرے شہروں سے حضرات تشریف لائیں، وہاں خود ہمارے شہر کی نمائندگی بھی ہو جائے اور اِس کی ابتدا ہم نے اپنے شعبے سے کی شعبۂ اُردو و اقبالیات کے دو اساتذہ یعنی پروفیسر سلیم ملک اور ڈاکٹر اسلم ادیب نے انتظامی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ اِنشائیے اور مقالے کے ذریعے بھی سیمینار میں شرکت کی۔ یہ دونوں نوجوان اساتذہ شعبۂ اُردو کا قیمتی اثاثہ ہیں۔ اور شعبے کو ان سے بجا طور پر بے حد توقعات ہیں۔ خُورشید ناظر صاحب کا میدان بے حد وسیع ہے۔ وُہ استاد بھی ہیں اور سیاستدان بھی۔ بہاول پُور سے وہ ایک ادبی مجلّہ بھی نکالتے ہیں اور مقامی اخبارات میں ان کے کالم بھی چھپتے رہتے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ اپنے صاف سُتھرے شعری و تنقیدی مذاق کے باعث وہ بہاول پُور کے ادبی حلقوں کی جان تصور کیے جاتے ہیں۔

مَیں پروفیسر عابد صدّیق اور رشید الزماں صاحب کا تذکرہ ایک ساتھ کرنا چاہوں گا کہ کئی باتوں میں دیانتدارانہ اِختلاف رکھنے کے باوجُود اصل میں دونوں ایک ہیں۔ دونوں دوست، دونوں کلاس فیلو، دونوں اُستاد، مُختلف زبانوں کے ماہر، دونوں موسیقی کا بڑا عمُدہ مذاق رکھنے والے اور دونوں ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کے شاگرد۔ مَیں اُمّید کرتا ہُوں کہ یہ دونوں صاحبانِ علم و بصیرت آئندہ بھی ہمارے ساتھ اپنا تعاون جاری رکھیں گے۔

پروفیسر مشکور حسین یاد کو اِسلامیہ یُونیورسٹی میں کسی طرح کی اجنبیت محسوس نہیں کرنا چاہیئے۔ اِس لِئے کہ ہمارے ہاں نہ صِرف اِن کے بہت سے شاگرد موجُود ہیں بلکہ کئی رفقائے کار بھی درس و تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ ویسے بھی اِنشائیہ سیمینار میں جو ہر اندیشہ اور ممکناتِ اِنشائیہ کا مصنّف موجُود نہ ہوتا تو ہمارا پروگرام بڑا روکھا پھیکا اور بے رنگ سا نظر

آتا۔ یقیناً یادؔ صاحب جدید دور کے نامور انشائیہ نگاروں میں شامل ہیں۔

ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ میں عابد صدیق صاحب اور رشید الزماں صاحب کی طرح مشکور حسین یادؔ اور ڈاکٹر سلیم اختر صاحب کا ذکر بھی ایک ساتھ کرتا لیکن میں ڈاکٹر سلیم اختر اور ڈاکٹر انور سدید کا ذکر ایک ساتھ کرنا چاہوں گا۔ در اصل اِن دونوں حضرات میں بھی قدرے اختلاف کے باوجود بڑی حد تک مماثلت کے پہلو موجود ہیں۔ میں اختلافات کو نظر انداز کرتے ہوئے آپ کے سامنے ان حضرات کی مماثلتیں پیش کروں گا کہ خیر کا پہلو اِسی راہ میں ہے

یہ دونوں حضرات واقعتاً عالم ہیں۔ صرف عالم ہی نہیں بلکہ اپنے علم کو منوانا بھی جانتے ہیں۔ ان کے لفظوں کا انتخاب عام طور پر ایک جیسا ہوتا ہے اور اس انتخاب کی اہم ترین خصوصیت گہرا طنز، لہجے کی کاٹ اور عالمانہ شان سے کھری کھری بات کہنے کا وہ سلیقہ ہے جو ہمارے بہت کم نقادوں کے حصے میں آیا ہے۔ ان دونوں ناقدین کی شان یہ ہے کہ یہ ہر موضوع پر لکھتے ہیں اور لکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ یہ دونوں حضرات اپنے اپنے دبستانوں کے اہم ترین نمائندے ہیں اور اگر آپ اجازت دیں تو میں تو یہاں تک کہوں گا کہ دبستانوں کے قائدین کے بعد یہی لوگ ہیں جو اپنے دبستانوں کے لئے بھی باعثِ عزت و صد افتخار ہیں۔

ع یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہوگئیں

کیا آپ حضرات اندازہ فرما سکتے ہیں کہ میں نے یہاں غالبؔ کا شعر کیوں پڑھا؟۔ در اصل مجھے اپنی زندگی کا وہ دور یاد آگیا جو میرے کرم فرما اور مہربان جناب وحید قریشی صاحب کی رفاقت میں گزرا۔ یہ میرے رفیقِ کار بھی رہے اور ڈین اور پرنسپل کی حیثیت میں افسر بھی اور اسی بنا پر مجھے یہ موقع ملا کہ میں انہیں قریب سے دیکھ سکوں۔ دیکھا اور بہت دیکھا لیکن حق یہ ہے کہ۔

ع مرحلہ طے نہ ہوا تیری شناسائی کا

میں ان کی عالمانہ شان کے بارے میں کچھ نہیں کہوں گا سوائے اس کے کہ ہمارے بہت سے اکابرِ علم قریشی صاحب کو حافظ محمود شیرانی کے بعد اردو کا اہم ترین محقق اور نقّاد قرار دیتے ہیں۔ البتہ میں ان قہقہوں کا ذکر ضرور کروں گا جو ہر وقت ان کے دفتر میں گونجتے رہتے تھے۔ لیکن حیرت اس امر پر ہے کہ اس سے نہ تو ڈاکٹر صاحب کے تدریسی مشاغل متاثر ہوتے تھے اور نہ علمی و تحقیقی کام میں اپنے طلبا و اساتذہ دونوں سے کہوں گا کہ وہ میرے محترم بزرگ ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کی شخصیت کو اپنے لئے مشعلِ راہ بنائیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر اس تقلیدی عمل سے آپ ڈاکٹر وحید قریشی نہ بھی بن سکے تو بھی ایسے ضرور بن جائیں گے کہ آپ بھی اپنے دائرے میں کسی قدر اہم ہو جائیں۔

بہر حال میں ڈاکٹر وحید قریشی صاحب اور آپ سب مہمانوں کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے اپنی بے پناہ مصروفیات کو نظر انداز کیا اور یہاں تشریف لانے کی زحمت گوارہ فرمائی۔ میں نے اور میرے رفقا نے آپ کی راحت کے لئے مقدور بھر کوشش کی اس کے باوجود اگر آپ کے لئے کوئی رنج دہ صورت پیدا ہوئی ہو تو میں معذرت کرتا ہوں اور یہ امید کرتا ہوں کہ آپ حضرات آئندہ بھی ہمارے ساتھ اسی طرح تعاون فرمائیں گے۔

تیسرا حصّہ

ڈاکٹر آغا یمین

آغا محمد یمین خان ۲۹ اگست ۱۹۲۴ء کو لاہور میں پیدا ہُوئے۔ ابتدائی تعلیم لدھیانہ میں حاصل کی ۱۹۵۵ء میں پنجاب یُونیورسٹی لاہور سے ایم اے فارسی کیا اور ۱۹۶۸ء میں اِسی مضمون پنجاب یُونیورسٹی ہی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لی۔ ۱۹۷۵ء میں تہران سے زبان و ادبیات فارسی میں ڈپلومہ لیا۔

آغا صاحب نے ۱۹۵۷ء میں صحافت کا ڈپلومہ لیا تھا۔ اسی بنا پر عملی زندگی کا آغاز صحافت سے کیا اور نوائے وقت، احسان اور روزنامہ آفاق میں کام کیا۔ بعدازاں لیکچرر ہو گئے اور مظفر گڑھ، گوجرہ، شیخوپورہ، گورنمنٹ کالج لاہور اور پنجاب یُونیورسٹی میں تدریسی فرائض انجام دیئے۔ آج کل اسلامیہ یُونیورسٹی بہاولپور میں صدرِ شعبۂ فارسی کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ ان کے اُردو و فارسی میں بہت سے تحقیقی و تنقیدی مقالات شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ آغا صاحب اُردو، فارسی اور پنجابی میں شعر بھی کہتے ہیں۔

ارشاد متین

ارشاد احمد متین ۲۴ جنوری ۱۹۵۰ء کو بہاولپور میں پیدا ہُوئے۔ ۱۹۷۵ء میں پنجاب یُونیورسٹی لاہور سے ایم۔ اے معاشیات اور ۱۹۸۳ء میں اسلامیہ یُونیورسٹی بہاول پور سے ایل۔ ایل۔ بی کے امتحان پاس کئے۔ ارشاد متین صاحب آج کل شعبۂ افرادی قوت و منصوبہ بندی بہاول پور میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔

شعر کہتے ہیں لیکن تنقید اور افسانہ نگاری سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔ بہاول پور میں سیّد آل احمد اور لاہور میں کشور ناہید گروپ سے متعلق ہیں۔

ڈاکٹر اسلم ادیب

ڈاکٹر اسلم ادیب ۵ مئی ۱۹۵۱ء کو ملتان میں پیدا ہوئے ۱۹۷۵ء میں زکریا یونیورسٹی ملتان سے گولڈ میڈل کے اعزاز کے ساتھ ایم۔اے اردو کا امتحان پاس کیا۔ بریڈ فورڈ یونیورسٹی انگلستان سے ۱۹۸۰ء میں ایجوکیشنل پلاننگ میں پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری لی۔ قیام برطانیہ کے زمانے میں تعلیم پر چار بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کی۔ انگلستان کی مختلف یونیورسٹیوں میں پانچ ٹریننگ کورسوں میں شمولیت کی۔ اس کے علاوہ انگلستان کے دو سرکاری تحقیقی پراجیکٹس پر کام کیا۔

ڈاکٹر صاحب ایک درجن سے زائد تحقیقی مقالات لکھ چکے ہیں اور اردو افسانہ، ناول اور تنقید ان کے خاص موضوعات ہیں۔

ڈاکٹر انور سدید

انور سدید ۴ دسمبر ۱۹۲۸ء کو سرگودھا کے ایک نواحی قصبے میانی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم سرگودھا اور ڈیرہ غازیخان کے مدرسوں میں حاصل کی۔ سول انجینئرنگ کی ڈگری انجینئرنگ کالج رسول سے طلائی تمغے کے ساتھ حاصل کی۔ انسٹی ٹیوٹ آف انجینئرز ڈھاکہ سے اے۔ایم۔آئی۔ای کی ڈگری لی۔ پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔اے اردو کا امتحان اوّل بدرجہ اوّل کے امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ اس کے بعد انہوں نے "اردو ادب کی تحریکیں" کے موضوع پر کام کر کے پنجاب یونیورسٹی ہی سے پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری لی۔

اب تک انور سدید کے انشائیوں کا ایک مجموعہ "ذکر اس پری وش کا" چھپ چکا ہے جب کہ دوسرا مجموعہ "آسمان میں پرندے" زیرِ طبع ہے۔ تنقید میں ان کی نو کتابیں۔ فکر و خیال،

اختلافات، اقبال کے کلاسیکی نقوش، غالب کا جہاں اور، وزیر آغا ایک مطالعہ، اُردو فسانے میں دیہات کی پیش کش. میر انیس کی اقلیمِ سخن، اُردو ادب کی تحریکیں اور انشائیہ اُردو ادب میں چھپ چکی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے غالب کے انداز میں ایک مجموعۂ مکاتیب بھی شائع کیا ہے جب کہ اپنے نام وزیر آغا کے خطوط بھی مرتب کیے ہیں۔ اُردو ادب کی مختصر تاریخ اور اُردو میں سفرنامہ زیرِ طبع کتابیں ہیں۔ اسی طرح صلاح الدین احمد پر بھی ان کی دو کتابیں جلد مارکیٹ میں آنے والی ہیں۔

انور سدید صاحب بے حد زود نویس مصنّف ہیں۔ اپنے سنجیدہ تخلیقی و تحقیقی اور تنقیدی کام کے علاوہ مختلف اخبارات و رسائل میں کالم بھی لکھتے ہیں اور یہ کالم مختلف زبانوں میں ہوتے ہیں۔

انور صابر

محمد انور صابر ۲۵ مارچ ۱۹۴۸ء کو گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۷۳ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔ اے اُردو کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۷۵ء میں اُردو کے اُستاد کی حیثیت سے ایس۔ ای کالج بہاول پور میں تقرری ہوئی اور آج تک اِسی کالج میں درس و تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

انور صابر صاحب نے ۱۹۸۲ء میں خورشید ناظر کے اشتراک سے مجلّہ "حروف" جاری کیا۔ آج کل اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور سے "پاکستان میں اُردو غزل کا ارتقاء" کے موضوع پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی سطح کا تحقیقی کام کر رہے ہیں۔ انہیں شاعری اور تنقید سے دلچسپی ہے۔

اورنگ زیب عالمگیر

اورنگ زیب عالمگیر ۲۹ اکتوبر ۱۹۵۳ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم بہاول پور میں حاصل کی ۱۹۷۵ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے اردو کا امتحان پاس کیا۔ ۲۴ جون ۱۹۷۶ء سے بہاول پور آرٹس کونسل میں پروگرام افسر کی حیثیت سے ملازمت شروع کی۔ ۱۵ جون ۱۹۸۲ء کو اسی ادارے میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر مقرر ہوئے اور ۲۹ نومبر ۱۹۸۶ء کو راولپنڈی اور لاہور کی خاک چھان کر دوبارہ ریذیڈنٹ ڈائریکٹر کی حیثیت سے بہاول پور آئے۔

اورنگ زیب صاحب شعر و ادب میں خصوصی دلچسپی رکھتے ہیں اور آج کل پنجاب یونیورسٹی سے "تدوینِ کلیاتِ شعرِ ناسخ" پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی سطح کا تحقیقی کام کر رہے ہیں۔

جاوید اختر

سید جاوید اختر خلف الرشید مولانا رشید اختر ندوی۔ ۱ جنوری ۱۹۴۳ء کو سرگودھا میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۶۹ء میں ایم۔ اے اردو کا امتحان پاس کیا۔ دو سال تک سید قاسم محمود اور ذکار الرحمٰن کے ساتھ ماہ نامہ "ادب لطیف" کی ادارت کے فرائض انجام دیئے۔ آج کل بہاولپور میں سٹیٹ لائف انشورنس کارپوریشن کے نمائندے کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔

سید جاوید اختر کی پانچ کتب شائع ہو چکی ہیں۔ جن میں دو افسانوی مجموعے "زہر خوشی کا" اور "کس سے منصفی چاہیں" شامل ہیں۔ جب کہ ایک بچوں کا ناول "ویران محل" ہے۔ ایک ناولٹ "اک شاخِ تمنا" ہے اور ایک کتاب ویت نام کی ثقافتی تاریخ بعنوان "بے تیغ لڑائی" شامل ہے۔ سید جاوید اختر کی چار کتب زیرِ طبع ہیں۔ یہ ریڈیائی ڈرامے بھی لکھتے رہے ہیں جو ترارکھل آزاد کشمیر، ملتان، بہاول پور اور وائس آف امریکہ سے نشر ہوئے۔ سید صاحب آج کل ملتان یونیورسٹی سے "اردو کی خواتین ناول نگار" کے موضوع پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی سطح کا تحقیقی کام کر رہے ہیں۔

خالد اختر

محمد خالد اختر ۲۱؍ جنوری ۱۹۱۹ء کو الٰہ آباد تحصیل لیاقت پور میں مولوی اختر علی صاحب کے ہاں پیدا ہوئے۔ بی۔ اے تک تعلیمی مراحل بہاول نگر اور بہاول پور سے طے کیے۔ ۱۹۴۰ء میں پنجاب یونیورسٹی سے الیکٹریکل انجینئرنگ میں بی ایس ای کی ڈگری لی۔ پھر پوسٹ گریجوایشن کے لیے برطانیہ چلے گئے۔ جہاں سے ۱۹۴۸ء میں واپسی ہوئی مختلف پرائیویٹ فرموں میں ملازمت کے بعد ۱۹۵۲ء میں پی۔ ڈبلیو۔ ڈی میں سب ڈویژنل انجینئر کی حیثیت سے ملازم ہوئے۔ ۱۹۶۲ء میں ایگزیکٹو انجینئر بنے اور جنوری ۱۹۸۰ء میں ریٹائر ہو گئے۔

افسانہ، ناول، سفرنامے اور مزاح لکھنے سے دِل چسپی رکھتے ہیں۔ اب تک پانچ کتابیں آچکی ہیں۔ "کھویا ہوا افق" پر آدم جی ادبی انعام بھی حاصل کیا۔ ادبی دُنیا بہاول پور کی ساکھ خالد اختر صاحب جیسے بزرگوں ہی کے دم سے ہے۔

خُورشید ناظر

خُورشید احمد ناظر ۲؍ جنوری ۱۹۴۴ء کو بہاول پُور میں پیدا ہوئے۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور سے بی۔ کام کی ڈگری لی۔ ابتداء میں فیملی پلاننگ میں مُلازمت اختیار کرلی۔ لیکن پھر اپنی افتادِ طبع سے مجبُور ہو کر درس وتدریس کو اپنا پیشہ بنا لیا۔ اس کے ساتھ ساتھ بہاول پُور سے ایک ادبی مجلّہ "حروف" جاری کیا جس کا پہلا شمارہ ۱۹۸۲ء میں آیا۔ خُورشید ناظر صاحب شعر کہتے اور تنقید لکھتے ہیں۔ ایک زمانے میں شعری وادبی محافل کی جان سمجھے جاتے تھے۔ لیکن آج کل سیاست کی وادی پُرخار بھی ان کے دم قدم سے گلستان کا نقشہ پیش کر رہی ہے۔

ڈاکٹر ذُوالفقار علی ملک

ڈاکٹر ذوالفقار علی ملک ۱۶ر نومبر ۱۹۳۶ئہ کو ملک حسن علی کے ہاں پیدا ہوُئے۔ اعزازات کے ساتھ ایم۔ اے عربی اور اسلامیات کے اِمتحان پاس کئے۔ پنجاب یُونیورسٹی ہی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لی۔ اِس کے بعد کینٹاب تشریف لے گئے۔ جہاں پر پہلے ایم۔ اے عربی اور بعدازاں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصِل کی۔

ڈاکٹر صاحب نے ۱۹۵۶ئہ میں ملازمت کا آغاز کیا اور اسلامیہ کالج لاہور میں عربی کے اُستاد مقرر ہوُئے۔ ۱۹۵۷ئہ میں ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ میں آگئے اور نومبر ۱۹۶۰ئہ میں پنجاب یونیورسٹی میں بحیثیت لیکچرر تقرری ہوُئی جہاں پر مختلف حیثیتوں میں مثلاً اسسٹنٹ پروفیسر، ایسوسی ایٹ پروفیسر، پروفیسر، صدر شعبہ عربی، ڈین فیکلٹی آف اورنٹیل اینڈ اسلامک لرننگ اور پرنسپل اورنٹیل کالج خدمات انجام دیں۔ اِس کے علاوہ آپ مختلف اہم کمیٹیوں کے ممبر رہے۔ جنوری ۱۹۸۵ئہ میں آپکو اِسلامیہ یُونیورسٹی بہاول پُور کے وائس چانسلر کی حیثیت سے بہاول پُور بھیجا گیا۔ جہاں پر آپ اپنے عِلمی و انتظامی خِدمات میں مصروف ہیں۔

ڈاکٹر ذوالفقار علی ملک کی اب تک عربی زبان و ادب پر نو سے زیادہ کتابیں چھپ چکی ہیں جب کہ شائع ہونے والے تنقیدی و تحقیقی مقالات کی تعداد بھی خاصی زیادہ ہے۔ جب کہ پانچ تحقیقی پروجیکٹس پر اب بھی کام جاری ہے۔ اپنے تحقیقی پروگرام کے عِلاوہ ڈاکٹر صاحب نے ایم۔ اے اور پی ایچ۔ ڈی کی سطح پر بلا مُبالغہ سینکڑوں سکالرز کی رہنمائی کی ہے۔

آپ کی دلچسپی کے موضُوعات میں قرانیات، سیرت النبیؐ، اسلامی تاریخ، اِسلامی کلچر اور عربی زبان و ادب کو خاص اہمیّت حاصِل ہے۔

رانا پٹیالوی

عبدالحکیم رانا پٹیالوی ۱۰ر فروری ۱۹۳۷ء کو نہیڑا ریاست پٹیالہ بھارت میں پیدا ہوئے۔ تقسیمِ ملک کے بعد کوٹ ادّو میں مقیم ہوئے اور میٹرک تک تعلیم یہیں پر حاصل کی۔ اِس کے بعد محکمۂ انہار میں ملازم ہوگئے۔ تونسہ، پنجند، ڈیرہ غازی خاں اور بہاول پور میں منصبی فرائض انجام دیتے۔ آج کل اسٹیٹ لائف انشورنش کارپوریشن سے وابستہ ہیں۔

ان کے تین شعری مجموعے زیرِ طبع ہیں۔ نُورپُر نور نگہ سیرت کانفرنس کے موقع پر نواب بہاول پور محمد عباس خاں عباسی مرحوم کی طرف سے سیمیں وطلائی تمغات کے علاوہ خطابات سے نوازا گیا۔

محمّد رشید الزّماں

محمد رشید الزماں کے آباؤ اجداد کا تعلق دھونکل ضلع گوجرانوالہ سے تھا۔ ستلج وادی میں نہروں کا جال بچھنے کے ساتھ ہی یہ لوگ بہاول نگر میں منتقل ہوئے۔ یہیں پر ۱۹۳۵ء میں رشید الزماں پیدا ہوئے۔ میٹرک ڈھرانوالہ کے قریبی اسکول سے کیا اِس کے بعد ایف سی کالج لاہور میں داخلہ لے لیا اور ۱۹۶۲ء میں اورنٹیل کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ایم اے اُردو کا امتحان پاس کیا۔ اِس کے بعد لاہور ہی کے ایک کالج میں اُردو کے اُستاد مقرر ہوتے لیکن پھر بہاول نگر آ گئے۔ بقول خود کہیں ایک جگہ ٹھکانہ نہ کیا۔ کچھ لوگوں کے ظلم اور کچھ لذّتِ آزار نے جگہ جگہ پھرایا۔ ایمان بچا کہ نہیں زمانے کی سیر البتّہ ہوگئی۔ لکھنے لکھانے کا شوق ابھی مرا نہیں شاید کچھ لکھا جائے۔

آج کل رشید الزّمان صاحب انٹر کالج بہاول پور کے پرنسپل کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔

سعید اختر

محمد سعید اختر ۲۵ر جولائی ۱۹۶۲ء کو پیدا ہوئے۔ آج کل اِسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور کے شعبۂ انگریزی میں زیرِ تعلیم ہیں۔ معروف مزاح نگار محمد خالد اختر کی صحبت ان کی شخصیت کی تعمیر و ترتیب میں اہم کردار ادا کر رہی ہے۔ اُن کا ایک سفرنامہ "نوپ" حال ہی میں شائع ہوا ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر

ڈاکٹر سلیم اختر صاحب ۱۱ مارچ ۱۹۳۴ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۶۱ء میں ایم۔ اے اُردو اور ۱۹۷۸ء میں پنجاب یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ جنوری ۱۹۶۲ء میں استادِ اُردو کی حیثیت سے اُن کا انتخاب عمل میں آیا۔ آٹھ سال گورنمنٹ ڈگری کالج بوسن روڈ ملتان میں اور تقریباً دو سال گورنمنٹ ڈگری کالج وحدت روڈ میں تدریس کے فرائض انجام دیئے۔ جُون ۱۹۷۲ء سے گورنمنٹ کالج لاہور میں کام کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کو اپنی تنقیدی و تحقیقی کُتب مثلاً ادب اور لاشعُور اور اقبال اور ہمارے فکری رویّے پر علی الترتیب داؤد ادبی انعام اور رائٹرز گلڈ انعام مل چکے ہیں۔ جب کہ یہ امر مستزاد ہے کہ ان کی ایک کتاب اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ اپنی افادیت کی بنا پر چھپنے اور فروخت ہونے کے ضمن میں تمام ریکارڈ توڑ چکی ہے۔

ادبی تاریخ و تنقید میں اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، تنقیدی دبستان، ادب اور لاشعور، افسانہ۔ حقیقت سے علامت تک، نگاہ اور نقطے، باغ و بہار کا تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ باغ و بہار (مقدمہ، ترتیب و تہذیب) تخلیق اور لاشعُوری محرکات، ادب اور کلچر، شعُور اور لاشعور کا شاعر غالبؔ۔ جوشؔ کا نفسیاتی مطالعہ، نفسیاتی تنقید، اور انشائیہ کی بنیاد شائع ہو چکی ہیں۔ اقبالیات کے دائرے میں اقبال کا نفسیاتی مطالعہ، اور اقبال اور ہمارے فکری رویے۔ اقبال کا ادبی نصب العین، اقبالیات کے نقوش، فکرِ اقبال کے منور گوشے۔ اقبال۔ شعاعِ صد رنگ، فکرِ اقبال کا تعارف، ایران میں اقبال شناسی کی روایت، اقبال۔ ممدوحِ عالم اور اقبال شناسی کے زاویے اشاعت پذیر ہو چکی ہیں۔

نفسیات ڈاکٹر صاحب کا خصُوصی موضوُع ہے اور اِس ضمن میں اُن کی آٹھ کُتب تین بڑے نفسیات داں، عورت جنس اور جذبات ہماری جنسی اور جذباتی زندگی، عورت جنس کے آئینے میں۔ مرد جنس کے آئینے میں، شادی۔ جنس اور جذبات، روزانہ چوبیس گھنٹے کیسے زندہ رہیں، ستائیے اور

زندگی بڑھاپیے، زیور طباعت سے آراستہ ہو چکی ہیں۔ اِس کے علاوہ ڈاکٹر سلیم اختر کا ایک ناولٹ۔ ضبط کی دیوار، ایک افسانوی مجموعہ کڑوے بادام اور طنز و مزاح کے سلسلے میں مضامین کا مجموعہ "کلام نرم و نازک" شائع ہو چکا ہے۔

محمدؐ سلیم ملک

محمدؐ سلیم ملک ۳ دسمبر ۱۹۵۰ء کو ضلع رحیم یار خاں کے ایک نواحی گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گاؤں کے مدرسے اور ثانوی درجے تک کے امتحانات رحیم یار خاں سے پاس کیے۔ ۱۹۷۲ء میں پنجاب یونیورسٹی سے بی۔ اے کا اور ۱۹۷۵ء میں کراچی یونیورسٹی سے ایم اے اُردو کا امتحان پاس کیا۔ ایم اے اُردو اور ایم اے لسانیات دونوں میں طلائی تمغے سے نوازے گئے۔ سلیم ملک نے فارسی و عربی زبانوں کے ڈپلومے بھی حاصل کیے۔ آج کل کراچی یونیورسٹی میں سید امتیاز علی تاج پر اپنا پی۔ ایچ ڈی کا مقالہ جمع کرا چکے ہیں۔

عملی زندگی کا آغاز ریڈیو پاکستان کراچی سے کیا لیکن صرف تین برس بعد جنوری ۱۹۸۰ء میں اسلامیہ یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو سے وابستگی اختیار کی۔

تنقیدی و تحقیقی مضامین کے علاوہ اِنشائیہ نگاری کی طرف میلانِ خاص رکھتے ہیں۔

سہیل اختر

سہیل اختر ۱۹۳۱ء میں سنگرور (مشرقی پنجاب بھارت) میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۵۹ء اور ۱۹۶۱ء میں علی الترتیب پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ایم اے فارسی اور ایم اے اُردو کی ڈگریاں لیں۔ درس و تدریس سے وابستگی اختیار کی۔ آج کل گورنمنٹ انٹر کالج بہاول پور میں صدر شعبۂ اُردو کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔

سہیل اختر کا شمار بہاول پُور کے نامور شعراء میں ہوتا ہے۔ اب تک پانچ شعری مجموعے لہُو کے دیپ، صلیبِ درد، کاسۂ دل، کربِ تنہائی اور قوسِ عقیدت شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ اُنھوں نے شعروں کے تین انتخاب "زندہ شعروں کا انتخاب" "چمن زارِ شعر" اور "مرقع بیت بازی" بھی مرتب کیے ہیں۔ شاعری کے علاوہ سہیل اختر صاحب کو افسانے سے بھی دلچسپی ہے اور ان کا افسانوی مجموعہ "کھلی کھڑکی" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ جب کہ انگریزی کہانیوں کے ترجموں کے دو مجموعے "قاتل کمپیوٹر" اور "کھل جا سم سم" بھی چھپ کر شائقین کے ہاتھوں میں پہنچ چکے ہیں۔

سیّد شہاب دہلوی

سید مسعود حسن شہاب دہلوی ۲۰ اکتوبر ۱۹۲۲ء میں سید منظور حسن رضوی کے ہاں دہلی میں پیدا ہوئے۔ بی۔ اے تک تعلیم حاصل کی اور صحافت کو پیشے کے طور پر اپنایا۔ دہلی سے ۱۹۴۰ء میں ہفت روزہ "الہام" جاری کیا۔ جو ہجرت کے بعد بہاول پُور سے تا حال نکل رہا ہے۔ شہاب صاحب کئی ادبی تنظیموں سے وابستہ رہے۔ لیکن اُردو اکیڈمی بہاول پُور سے اُن کی وابستگی اپنے دورانیے اور نتائج کے اعتبار سے خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ اِسی ادبی تنظیم کے تحت شہاب صاحب کی زیرِ ادارت "الزبیر" بھی باقاعدگی سے نکل رہا ہے۔ جس کے خصوصی نمبر بطورِ خاص حوالے کی چیز بن گئے ہیں۔

شہاب صاحب کی تصانیف کی تعداد ایک درجن سے زائد ہے۔ جب کہ ترتیب و تالیف کے سلسلے کی کُتب اس کے علاوہ ہیں۔ نثر میں شہاب صاحب اب تک خواجہ غلام فرید (حیات و شاعری)، خطۂ پاک اوچ، اولیائے بہاول پُور، لطائف سیریہ، تکملہ سیر الاولیاء، بہاول پُور کی سیاسی تاریخ، بہاول کی سالمیت، مشاہیر بہاول پُور، بہاول پُور میں اُردو اور ان کی اپنی خود نوشت سوانح حیات وادیٔ جمنا سے وادیٔ ہاکڑہ تک چھپ چکی ہیں۔ جب کہ شاعری میں نقوشِ شہاب، جنگ نامہ، موجِ نُور اور گل و سنگ چار مجموعے چھپ چکے ہیں۔

سیّد شہود رضوی

بہاول پور کے معروف ادیب سیّد شہاب دہلوی کے بڑے صاحبزادے، ۱۹۵۴ء میں بہاول پور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم بہاول پور ہی سے حاصل کی۔ عملی زندگی کا آغاز صحافت سے کیا۔ پہلے "الہام" میں کام کرتے رہے پھر روزنامہ نوائے وقت کے نمائندہ خصوصی کی حیثیت سے کام کیا۔ ۱۹۷۵ء میں بہاول پور میں ریڈیو اسٹیشن قائم ہوا تو ریڈیو میں ملازمت اختیار کرلی اور اب تک یہیں کام کر رہے ہیں۔

ظہور آثم

ظہور احمد آثم ۲ر نومبر ۱۹۵۲ء کو بہاول پور میں پیدا ہوئے۔ میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ شعرو شاعری سے دلچسپی رکھتے ہیں، اور آج کل بہاول پور سے ادبی مجلّہ "سطور" نکال رہے ہیں۔

ظہور الحق

کرنل ریٹائرڈ ظہور الحق ۱۶ر فروری ۱۹۲۷ء کو فیصل آباد میں پیدا ہوئے۔ بی اے تک تعلیم کے تمام مراحل گجرات میں طے کیے اور ۱۹۴۹ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے معاشیات کی ڈگری حاصل کی۔

عملی زندگی کا آغاز صحافت سے کیا اور دو برس تک ہفت روزہ "اکنامسٹ" کے مدیر اعلیٰ رہے۔ بعد ازاں ٹیکس کے محکمے میں تین سال تک خدمات انجام دیں۔ بالآخر ۱۹۵۲ء میں فوج کے محکمہ تعلیم سے وابستہ ہوئے اور مختلف اعلیٰ عہدوں پر فائز رہنے کے بعد ۱۹۷۹ء میں ریٹائرمنٹ حاصل کی۔ اس کے ساتھ ہی صادق پبلک اسکول کے پرنسپل کی حیثیت سے تقرری عمل میں آئی اور آپ بہاول پور تشریف لائے۔

اگرچہ کرنل صاحب بظاہر شعر و ادب کی دُنیا سے دُور دُور رہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ شعر و ادب سے ان کی دلچسپی زندگی کے کسی بھی دُور میں کم نہ ہوئی۔ کرنل صاحب اب تک تین ناول۔ ایک ہی راستہ، پتھر اور پانی اور خاکِ وطن لکھ چکے ہیں جن میں سے دو اشاعت پذیر بھی ہوئے۔ اسی طرح ان کا ایک افسانہ مجموعہ "جنت کے آنسو" ۱۹۲۹ء میں زیورِ طباعت سے آراستہ ہو چکا ہے۔

عابد صدیق

عابد صدیق ۱۲ مئی ۱۹۳۹ء کو منڈی دوراہا ریاست پٹیالہ بھارت میں پیدا ہوئے ۱۹۶۲ء میں اورنٹیل کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ایم اے اُردو کا امتحان پاس کیا۔ اسی سال گورنمنٹ کالج ملتان میں اُستادِ اُردو مقرر ہوئے اور مختلف کالجوں میں تدریس کے فرائض انجام دینے کے بعد آج کل گورنمنٹ ایس۔ ای کالج بہاول پور میں پڑھا رہے ہیں۔

گو عابد صدیق صاحب مختلف میدانوں کے شہ سوار ہیں لیکن اُن کا اصل میدان اُردو ادب ہی ہے۔ ان کی اب تک دو کتابیں یعنی "مغربی تنقید کا مطالعہ۔ افلاطون سے ایلیٹ تک" مطبوعہ ۱۹۸۲ء اور ایک شعری مجموعہ "پانی میں مہتاب" مطبوعہ ۱۹۸۶ء میں چھپ چکی ہیں۔ مجموعۂ مضامین "تحسینیات" زیرِ طبع ہے۔

ڈاکٹر عقیلہ شاہین

ڈاکٹر عقیلہ شاہین صاحبہ نے ۱۹۷۵ء میں بہاؤ الدین زکریا یونیورسٹی ملتان سے ایم۔ اے اُردو کا امتحان پاس کیا۔ ستمبر ۱۹۷۸ء سے شعبۂ اُردو اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور میں جز وقتی اُستاد کے طور پر تدریس کے فرائض انجام دینے لگیں۔ یکم مئی ۱۹۷۹ء سے یونیورسٹی میں کل وقتی طور پر ملازمت حاصل کی۔

عقیلہ شاہین صاحبہ نے کراچی یونیورسٹی سے "علامہ نیاز فتح پوری ۔۔۔ احوال و آثار" کے موضوع پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی سطح کا تحقیقی کام کیا اور ڈگری حاصل کی۔

علی تنہا

علی تنہا کا تعلق خانیوال سے ہے۔ لیکن یہ ۱۵ ر اگست ۱۹۵۲ئہ کو پشاور میں پیدا ہُوئے۔ ۱۹۷۰ئہ میں پنجاب یُونیورسٹی لاہور سے ایم۔ اے صحافت کا امتحان پاس کیا اور ریڈیو پاکستان میں مُلازمت اِختیار کی۔ آج کل ریڈیو سٹیشن بہاول پُور میں سینئر پروڈیوسر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ ان کا پہلا افسانہ ۱۹۷۲ء میں شائع ہُوا جب کہ ۱۹۸۵ئہ میں افسانوں کا مجمُوعہ "کئی دنوں کا دن" شائع ہُوا۔

سیّد مشکُور حسین یاد

سیّد مشکُور حسین یاد ۹ر ستمبر ۱۹۲۵ئہ کو پیدا ہُوئے۔ پنجاب یُونیورسٹی لاہور سے ایم اے اُردو اور ایم اے فارسی کے امتحان پاس کیے اور اُردو زبان و ادب کے اُستاد مقرر ہُوئے تقریباً بائیس برس تک گورنمنٹ کالج لاہور میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ یاد صاحب مختلف علمی و ادبی کمیٹیوں کے رُکن رہے اور کئی رسائل و جرائد ادب کے عملۂ ادارت میں شامل رہے۔

مشکُور حسین یاد کی تیرہ کتابیں چھپ چکی ہیں۔ جن میں شاعری کی مفہوم زمانہ، ایران صبحدم، میں اُردو ہُوں، گونگی نظمیں اور ستم ظریف، مزاحیہ مضامین کے مجموعوں کے سِلسلے میں دُشنام کے آئینے: اپنی صُورت آپ، لاحول ولاقوہ، تماشہ کہیں جسے اور ستارے چہچہاتے ہیں۔ قابلِ ذکر ہیں۔ اِنشائیوں کے مجمُوعہ کے طور پر جوہر اندیشہ اور انشائیہ پر تنقید کے ضمن میں ممکناتِ انشائیہ یاد صاحب کی معروف تصانیف ہیں جب کہ "آزادی کے چراغ" کے عنوان سے اُنھوں نے تحریکِ پاکستان پر بھی ایک کتاب لکھی ہے۔

شاعری، اِنشائیوں، تنقید، سفرنامے اور مزاحیہ مضامین کے ضمن میں ان کی پانچ کُتب زیرِ طبع ہیں جو جلد ہی شائقین کے ہاتھوں میں پہنچ جائیں گی۔

ممتاز احمد خان

ممتاز احمد خان ولد بشیر احمد خان ۱۵ اکتوبر ۱۹۶۳ء کو مظفر گڑھ میں پیدا ہوئے۔ سیاسیات میں ایم اے کیا۔ ایل۔ ایل۔ بی کا امتحان پاس کیا اور صحافت میں ڈپلومہ حاصل کیا۔ آج کل ضلعی افسر اطلاعات کی حیثیت سے محکمہ اطلاعات بہاول پور میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔

ادب سے اپنی دلچسپی کے باعث یہ حلقہ احباب ادب بہاول پور کے صدر بنائے گئے اس کے علاوہ بزم سخن ملتان کے معتمد عمومی بھی ہیں۔

ممتاز احمد خان صاحب کو انشائیہ، تنقید، افسانہ اور تراجم سے خصوصی دلچسپی ہے۔

منوّر جمیل قریشی

منور جمیل قریشی نے ۱۹۶۸ء سے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز کیا۔ شعر و نثر دونوں لکھتے ہیں۔ "خواب سے خالی آنکھیں" شعری مجموعہ زیرِ طبع ہے۔ سائبان کے شریک مدیر ہیں۔ اس کے علاوہ کلیاتِ ظہورِ نظر، دنیائے اسلام کا خاموش شہزادہ، پرنس کریم آغا خان مرتب کر چکے ہیں۔ آج کل روزنامہ "دستور" سے وابستہ ہیں۔

نوشی گیلانی

نشاط مسعود گیلانی ۱۴ مارچ ۱۹۶۴ء کو بہاول پور میں پیدا ہوئیں۔ تعلیم کے تمام مراحل بھی بہاول پور ہی میں طے کیے۔ آج کل شعبۂ اردو اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور سے ایم۔ اے کر رہی ہیں۔ نسبتاً کم عمری کے باوجود اپنی شاعری کے باعث ملک کے شعری و ادبی حلقوں میں پہچانی جانے لگی ہیں۔ ایک مجموعہ "ریت پہ لکھا نام" زیرِ طبع ہے۔ "سائبان" کی شریک مدیر ہیں۔

ڈاکٹر وحید قریشی

ڈاکٹر عبدالوحید قریشی ۱۴ فروری ۱۹۲۵ء کو میانوالی میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ایم اے فارسی اور ایم۔ اے تاریخ کے امتحانات پنجاب یونیورسٹی سے پاس کیے۔ اسی تعلیمی ادارے سے فارسی میں پی۔ ایچ۔ ڈی (PHD) اور اردو میں ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی۔

۱۹۵۶ء ۱۹۶۲ء میں اسلامیہ کالج لاہور میں اُستادِ شعبہ اردو اور صدر شعبہ فارسی کی حیثیت سے کام کیا۔ ۱۹۶۲ء میں اورنٹیل کالج سے منسلک ہوئے اور یہاں پر غالب پروفیسر اردو، صدر شعبہ اردو ڈین فیکلٹی علوم اسلامیہ و شرقیہ اور پرنسپل اورنٹیل کالج کی حیثیت سے فرائض منصبی انجام دیئے۔ ڈاکٹر صاحب اقبال اکیڈیمی لاہور کے قائم مقام ڈائریکٹر بھی رہے۔ جب کہ مارچ ۱۹۸۳ء میں مقتدرہ قومی زبان کے صدر نشیں مقرر ہوئے۔ آج کل بزمِ اقبال لاہور کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے اہم ادبی وعلمی خدمات میں مصروف ہیں۔

اب تک ڈاکٹر صاحب کے بے شمار تحقیقی و تنقیدی مضامین و مقالات شائع ہو چکے ہیں جب کہ بیس کے قریب کتب بھی زیورِ طباعت سے آراستہ ہو چکی ہیں۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

۱۔ شبلی کی حیاتِ معاشقہ ۱۹۵۲ء	۲۔ انتخاب سودا مع مقدمہ ۱۹۵۳ء
۳۔ مقدمہ شعر و شاعری (ترتیب و تحشیہ) ۱۹۵۹ء	۴۔ میر حسن اور ان کا زمانہ ۱۹۵۹ء
۵۔ نامۂ عشق (ترتیب و تحشیہ) ۱۹۵۹ء	۶۔ ثواقب المناقب (ترتیب و تحشیہ) ۱۹۶۰-۶۱ء
۷۔ مطالعہ حالی (مقالات) ۱۹۶۱ء	۸۔ دربار ملی بہ اشتراک شیخ محمد اکرام ۱۹۶۱ء
۹۔ پنجاب میں اردو (ترتیب و تحشیہ) ۱۹۶۳ء	۱۰۔ یار نامہ عبدی قیصر شاہی (ترتیب و تحشیہ) ۱۹۶۳ء
۱۱۔ اردو کا بہترین انشائی ادب (ترتیب) ۱۹۶۴ء	۱۲۔ انتخاب آتش مع مقدمہ ۱۹۶۵ء
۱۳۔ مثنوی سحر البیان (ترتیب و تحشیہ) ۱۹۶۵ء	۱۴۔ مثنویات میر حسن۔ جلد اول (ترتیب و تحشیہ) ۱۹۶۵ء

۱۵۔ کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ ۱۹۶۵ء ۱۶۔ تنقیدی مطالعے (مقالات) ۱۹۶۶ء

۱۷۔ باغ و بہار ایک تجزیہ ۱۹۶۵ء ۱۸۔ نذرِ غالب۔ مطبوعہ ۱۹۶۸ء

۱۹۔ پاکستان کی نظریاتی بنیادیں (۱۹۸۰ء) (اردو، انگریزی) ۲۰۔ تحقیقی مقالات مطبوعہ ۱۹۸۸ء

۲۱۔ پاکستانی قومیت کی تشکیل اور دوسرے مقالات مطبوعہ ۱۹۸۵ء

اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کا ایک شعری مجموعہ "نقدِ جاں" ۱۹۷۶ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ "نقدِ جاں" کے بعد دوسرا شعری مجموعہ "الواح" ۱۹۸۴ء میں چھپا۔

ڈاکٹر وزیر آغا

ڈاکٹر وزیر آغا ۱۸ مئی ۱۹۲۲ء کو سرگودھا کے ایک نواحی گاؤں وزیر کوٹ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں کے علاوہ سلانوالی، سرگودھا اور جھنگ سے حاصل کی۔ ۱۹۴۳ء میں ایم اے معاشیات کی ڈگری لی اور ۱۹۵۶ء میں پنجاب یونیورسٹی سے "اردو ادب میں طنز و مزاح" کے موضوع پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

ڈاکٹر وزیر آغا کا پیشہ کاشتکاری ہے لیکن ان مصروفیات کے ساتھ ساتھ وہ ادب کی خدمت میں بھی منہمک رہے۔ وہ لاتعداد تنقیدی و تحقیقی مقالات کے ساتھ ساتھ دو درجن سے زائد کتب کے مصنف ہیں۔ شاعری میں ان کے پانچ مجموعے "شام اور سائے"، "نردبان"، "دن کا زرد پہاڑ"، "غزلیں" اور "گھاس اور تتلیاں" آ چکے ہیں۔ انشائیہ میں اُن کے تین مجموعے "خیال پارے"، "چوری سے یاری تک" اور "دوسرا کنارا" شائع ہو چکے ہیں۔ جب کہ تنقید میں "اردو ادب میں طنز و مزاح"، "نظم جدید کی کروٹیں"، "اُردو شاعری کا مزاج"، "تنقید اور احتساب"، "نئے مقالات"، "تنقید اور مجلسی تنقید"، "نئے تناظر"، "دائرے اور لکیریں"، "تصوراتِ عشق و خرد۔ اقبال کی نظر میں"، ڈاکٹر صاحب کی اہم کتابیں ہیں۔ جب کہ ان کی خودنوشت سوانح عمری "شام کی منڈیر سے" بھی چھپ چکی ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا کا شمار ہمارے اُن ادیبوں اور ناقدین میں ہوتا ہے جو ایک باقاعدہ دبستان کے مرکز و محور کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ بات اُن کے لئے باعثِ فخر ہے کہ ادبی دُنیا اور اوراق کے صفحات کے توسط سے اُنھوں نے اُردو تخلیق کاروں اور ناقدین کی ایک بڑی کھیپ کو پروان چڑھایا ہے۔ اِنشائیہ کے بارے میں آج جس قدر سرگرمی نظر آتی ہے وہ بھی محض آغا صاحب کے دم قدم سے ہے۔

چوتھا حصّہ

"ذرا بہاول پُور تک"

مرتبہ - ڈاکٹر انور سدید

مطبوعہ - ۲۲ / ۲۹ اپریل ۱۹۸۹ء
ہفت روزہ ایڈیشن روزنامہ امروز

ایک ماہ کے قلیل عرصے میں یہ انور سدید کا دُوسرا دُورہ تھا۔ اُردو کے منفرد اور ممتاز مزاح نگار محمدؐ خالد اختر جن کی وضعداری سادگی اُن کی شہرت میں معاونت نہیں کرتی اور جن کے فن کی عظمت اُن کی ذات سے بہت آگے نکل چکی ہے۔ اسے دیکھتے ہی بولے "آپ پھر بہاول پُور آ گئے؟ کیا اس شہر کو فتح کرنے کے ارادے ہیں۔ تعریف و تحسین کے ایسے مواقع پر انور سدید اپنے پاؤں زمین پر مضبُوطی سے گاڑ لیتا ہے اور ہوا میں بے پَر اُڑنے کی کوشش نہیں کرتا۔ اِس نے جواب دیا۔ "محمدؐ خالد اختر صاحب! میں تو پہلے بھی اِس شہر کی بے پناہ اور بے لوث محبّتوں سے مغلُوب ہو کر گیا تھا۔ اب پھر مفتوح ہونے کے لئے آیا ہُوں۔"

دو ہفتے قبل "حلقۂ احبابِ ادب" کے زیرِ اہتمام افسانہ نگار علی تنہا، ارشاد متین اور ممتاز ملک نے ڈاکٹر وزیر آغا کے ساتھ ایک شام بے حد خوبصورت انداز میں منائی تھی اور اِس میں غزل کا مُشاعرہ کرنے کی بجائے نظم کے مشاعرے کی طرح ڈالی تھی۔ اور انور سدید اِس محفل

میں ایک سامع کی حیثیت میں شریک تھا۔ اگلے مہینے جب لودھراں کے لیے جہاں پہلی آل پاکستان انشائیہ کانفرنس ۱۹۸۸ء منعقد ہو رہی تھی، رختِ سفر باندھ جا رہا تھا تو سلیم ملک نے آکر بتایا۔ اسلامیہ یونیورسٹی بھی اس ماہ کے اواخر میں یہاں انشائیہ سیمینار کرا رہی ہے۔ اس میں آپ کی شرکت کے لیے غیر رسمی دعوت نامہ لایا ہوں۔" اس وقت ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنی علالت کے خلاف عَلَمِ دفاع بلند کر رکھا تھا۔ لیکن جب ایک اور سفر درپیش آ گیا تو بے بسی سے پروفیسر سلیم ملک کی طرف دیکھا۔" ایک ہی ماہ میں انشائیہ کی دو تقریبات"؟ انور سدید نے اس طرح پوچھا جیسے مقصد یہ باور کرانا ہو کہ" وقفہ بہت ضروری ہے۔" ڈاکٹر وزیر آغا نے استدعائیہ لہجے میں کہا "مجھے اپریل میں مولوی عبدالحق یادگاری لیکچر میں شرکت کے لیے کراچی جانا ہے۔ کیا آپ انشائیہ سیمینار بھی انہی تاریخوں میں منعقد نہیں کر سکتے"؟ لیکن شاید اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور کے شعبۂ اُردو کے لیے جس کے زیرِ اہتمام انشائیہ سیمینار منعقد ہو رہا تھا، یہ ممکن نہ تھا۔ چنانچہ لاہور پہنچتے ہی ڈاکٹر شفیق احمد کا جو خط ملا، اُس کا مفہوم کچھ اس طرح کا تھا — "اگر ڈاکٹر وزیر آغا اور انور سدید نے شرکت نہ کی تو سیمینار منعقد کرنے کا مقصد پورا نہ ہو گا اور انشائیہ کی اطراف میں جو گرد بکھیری جا رہی تھی، وہ اور دبیز ہو جائے گی"— گویا مسئلہ اب انشائیہ کے فن کا نہیں رہا تھا بلکہ اُس کی عزت کا بن چکا تھا۔ ایسے مواقع پر عقل محوِ تماشائے بام کا مشورہ دیتی ہے لیکن انور سدید میدانِ عمل میں بے محابا کود پڑتا ہے۔ ڈاکٹر شفیق احمد نے آتشِ عشق کو سلگانے کے لیے تیر بہدف نسخے سے کام لیا تھا۔

سیمینار میں شرکت کا دعوت نامہ ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کو بھی ملا تھا اور وُہ اپنی علالت کے باوجود آمادۂ سفر تھے۔ انشائیہ کی حزبِ اختلاف کی نمائندگی کے لیے لاہور ہی سے جو اصحاب مدعو کیے گئے تھے، اُن میں سے ایک کا دعویٰ تھا کہ اُنہوں نے پہلا انشائیہ اُس وقت لکھا تھا جب وہ تیسری جماعت میں پڑھتے تھے۔ ان کے اس موقف کی تائید میں "خامہ بگوش"[1]

۱۔ مشفق خواجہ کا قلمی نام جو اُنھوں نے تکبیر کے کالموں میں استعمال کیا۔

نے عرض کیا تھا ـــ" یاد صاحب کا پہلا اِنشائیہ ہی نہیں، باقی تمام اِنشائیے بھی تیسری جماعت ہی کے لکھے ہُوئے معلُوم ہوتے ہیں۔"

دُوسرے صاحب "اوراق" کے صفحات سے اُبھرے تھے۔ انھوں نے "ماہِ نو" میں پندرہ سال پہلے ایک مقالہ اِنشائیہ کے حق میں لِکھا اور عرصے تک عرش صدیقی صاحب کو ناراض کئے رکھا تھا۔ لیکن پھر نظریۂ ضرورت کے تحت اِنشائیہ کے بارے میں اپنا رویّہ منفی کر لیا اور اب نہ صِرف اِس صِنف کا سیاپا کرنے لگے تھے بلکہ "اوراق" کے اِنشائیہ نگار اُنہیں زہر لگنے لگے تھے۔ اِس ادبی ناہمواری پر خامہ بگوش نے یُوں تبصرہ کیا تھا۔

"سلیم اختر خُود بھی اوراق میں لِکھتے رہے ہیں۔ اب اُنہیں اوراق میں لکھنے والا ہر ادیب غیر معیاری نظر آتا ہے۔ یہ ایک نفسیاتی مسئلہ ہے جسے وہی حل کر سکتا ہے جس نے نفسیاتی تنقید میں پی۔ ایچ۔ ڈی کر رکھی ہو"۔ انور سدید نے سوچا اِنشائیہ کی حزبِ اختلاف میں سے یہی دو صحاب شرکت کا زیادہ حق رکھتے ہیں کیونکہ انشائیہ کی بنیاد منہدم کرنے کے لِئے ان سے بہتر خدمات کون انجام دے سکتا ہے"۔ اِس نے یہ سوچا اور پھر خُود ہی ہنس پڑا۔

لاہور ایئر پورٹ پر ڈاکٹر وحید قریشی اور انور سدید اکٹھے پہنچے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے پُوچھا۔ آغا صاحب کِس وقت پہنچیں گے؟ "وہ بیمار ہو گئے ہیں۔ ڈاکٹر نے اُنہیں سفر کرنے کی اجازت نہیں دی"۔ انور سدید نے کہا۔ "میں نے بہاول پور جانے کی حامی ہی اِس خیال سے بھری تھی کہ وزیر آغا صاحب کا ساتھ ہو گا۔ کچھ وقت اکٹھے گزاریں گے۔ یہ کہہ کر ڈاکٹر وحید قریشی معنی خیز انداز میں مُسکرائے اور بولے۔ "اب دفاعی مورچہ انور سدید کو سنبھالنا ہو گا۔ لیکن وہ دفاع سے پہلے حملہ زن ہو جاتا ہے۔ فریقِ مخالف بھگل جاتا ہے"۔ انور سدید نے ڈاکٹر وحید قریشی کا جُملہ غور سے سُنا لیکن وہ فیصلہ نہ کر سکا کہ ڈاکٹر صاحب اِسے داد دے رہے ہیں یا بے داد سے کام لے رہے ہیں۔

ڈاکٹر وحید قریشی اور انور سدید لاؤنج کے صدر دروازے کے سامنے والی نشستوں پر بیٹھے تھے۔ دروازے سے روشنی کی پھوار بھی بے محابا آ رہی تھی جس سے مُسافروں کی پہچان آسان ہو جاتی

تھی۔ ڈاکٹر سلیم اختر اور مشکور حسین یاد آئے اور ساتھ کی نشستوں پر بیٹھے انہیں ڈاکٹر وحید قریشی نظر ہی نہیں آئے یا شاید مرتضےٰ حسین فاضل لکھنوی کی تقریب سے جو گرد اُڑی تھی، اس نے یاد صاحب کے ضمیر پر بوجھ سا ڈال دیا تھا اور وہ وحید قریشی سے آنکھیں چرا رہے تھے۔ انور سدید کو وہ دن یاد آرہا تھا جب وحید قریشی مقتدرہ قومی زبان کے صدر نشین تھے اور لوگ اُنھیں شہد کا چھتہ سمجھ کر چمٹے رہتے تھے۔ اِس زمانے میں یہ اصحاب ڈاکٹر وحید قریشی کے مداحوں میں سے تھے۔ پھر خبر اُڑی کہ وہ مقتدرہ سے علیحدگی اختیار کر کے لاہور واپس آرہے ہیں اور اپنے نامکمل مسودوں کی تکمیل کا ارادہ رکھتے ہیں۔ پھر اِسی حلقے سے یہ بات اُڑائی گئی کہ "اب ڈاکٹر وحید قریشی کے پاس مکھی بھی نہیں بیٹھے گی۔" اور واقعی لوگوں نے دیکھا کہ مکھیاں اُڑ گئی تھیں کہ مقتدرہ کے نئے صدر نشین لاہور تشریف لائے۔ وحید قریشی کے پاس صرف صابر لودھی، ڈاکٹر معین الرحمٰن اور سلیم آغا قزلباش بیٹھے تھے اور مکھیاں ڈاکٹر جمیل جالبی کے گرد منڈلا رہی تھیں۔

انور سدید ماضی کے خارزاروں میں اُلجھا ہوا تھا کہ لاؤنج کا دروازہ کھلا۔ مائیکروفون پر ایک نسوانی آواز اُبھر رہی تھی۔ "خواتین و حضرات بہاول پور کے لِئے پی آئی اے کی فلائٹ تیار ہے۔ مسافروں سے درخواست ہے کہ وہ جہاز پر تشریف لے چلیں" مشکور حسین یاد اور سلیم اختر اُٹھے اور طیارے پر سوار ہونے کے لِئے ٹرالی میں جا بیٹھے۔ ڈاکٹر وحید قریشی اُنھیں اِس دفعہ بھی نظر نہیں آئے۔ ڈاکٹر صاحب "ٹریول لائٹ" کے اصول پر عمل کر رہے تھے۔ ان کا سفری بیگ ہلکا سا تھا۔ لیکن علالت کی بناء پر ان کا سانس پھولنے لگا تو بیگ انور سدید نے تھام لیا۔ ٹرالی میں ڈاکٹر وحید قریشی کھڑے تھے۔ سلیم اختر لپک کر آئے۔ "ہم آپ کے استقبال کے لِئے یہاں کھڑے ہیں۔" ان کے ساتھ مشکور حسین یاد تھے۔ انور سدید نے موقع غنیمت جانا اور ڈاکٹر صاحب کو خالی نشست پر بیٹھنے کی درخواست کی۔ اب بیٹھنے کے لِئے کوئی جگہ خالی نہیں رہی تھی۔ دروازے کے سامنے اعجاز حسین بٹالوی ایستادہ تھے۔ اُنہوں نے ہاتھ ہلا کر پوچھا۔ "یہ ادیبوں کی کہکشاں کہاں جا رہی ہے۔" "کیا آپ اِس میں شریک نہیں۔؟ انور سدید نے پوچھا۔

"میں تو ڈویژن بنچ بہاول پور میں ایک مقدمے میں جا رہا ہوں۔ عدلیہ پی آئی اے والوں پر مہربان نظر آتی ہے۔ اُنھوں نے ایک بنچ بہاول پور میں بھی قائم کر رکھا ہے!" بہاول پور میں انشائیہ کانفرنس ہے"۔ انور سدید نے کہا۔

بہاول پور ایئر پورٹ پر ڈاکٹر شفیق احمد، ڈاکٹر اسلم ادیب اور ڈاکٹر سلیم ملک دُور سے ہاتھ لہرا رہے تھے۔ انور سدید اعجاز بٹالوی کے ساتھ مصروفِ گفتگو تھا۔ اعجاز بٹالوی کہہ رہے تھے۔ "انور سدید انشائیہ پر سیمینار چہ معنی دارد"؟ انشائیہ تو لکھنے اور پھر پڑھنے کی چیز ہے تنقید اِس کے مزاج کو مجروح کر ڈالتی ہے اور ان سے پوچھئے گا کہ سیمینار کا مفہوم کسی کو آتا ہے۔ یہ لفظ سیمن سے نکلا ہے"۔ یہ کہہ کر اعجاز بٹالوی تھوڑا سا مسکرائے۔ "جی ہاں عیسائی پادریوں نے تبلیغِ مذہب کے لئے کلکتہ اور سی رام پور میں سیمی زبان قائم کی تھیں"۔ انور سدید نے کہا۔

اَب وہ ایئر پورٹ سے باہر آ چکے تھے۔ ڈاکٹر شفیق احمد انھیں کاروں میں بٹھا رہے تھے۔ ڈاکٹر وحید قریشی اور انور سدید ایک کار میں بیٹھے۔ باقی دو مہمانوں کو ڈاکٹر اسلم ادیب اپنے ساتھ لے گئے۔ ڈاکٹر شفیق افسوس کر رہے تھے کہ "علالت کی وجہ سے ڈاکٹر وزیر آغا نہیں آ سکے۔ وہ اہلِ بہاول پور کا دل گزشتہ دَورے میں جیت کر لے گئے۔ اب پُورا بہاول پور ان کے لئے چشم براہ ہے۔ اِنشائیہ "چوری سے یاری تک" ہمارے نصاب میں شامل ہے۔ اس پر خان پور کالج کے ایک پرنسپل نے خُوب ہاہا کار مچائی تھی[1]۔ لیکن ان کی چل نہ سکی۔ ہمارے طلبہ بھی وزیر آغا صاحب سے مِلنے کے بہت مشتاق ہیں"۔

اب ادیبوں کی کہکشاں اسلامیہ یُونیورسٹی بہاول پُور کے رسیٹ ہاؤس میں اُتر رہی ہے۔ مشکور حسین یاد اور سلیم اختر الگ کمرے میں ٹھہرائے گئے ہیں۔ رسیٹ ہاؤس کے دُوسرے حصّے میں ڈاکٹر وحید قریشی اور انور سدید ٹھہرائے گئے ہیں۔ ان کے درمیان "متعدد" کمروں اور تین غلام گردشوں کا فاصلہ ہے۔ لیکن کھانے کا کمرہ ایک ہی ہے۔ ڈاکٹر شفیق کو وحید قریشی کہہ رہے ہیں"۔ آپ نے شیر اور بکری کو ایک ہی میز پر جمع کر دیا ہے"۔ لیکن سلیم اختر سامنے نظر نہیں

۱۔ یہاں ڈاکٹر صاحب کو تسامح ہُوا ہے۔ صورتِ واقعہ کچھ اور ہے جس کے ذکر کی ضرورت نہیں۔ مرتب

آ رہے ہیں۔ مشکور حسین یاد کہہ رہے ہیں" سلیم اختر کی طبیعت خراب ہے۔ اُنہیں جہاز میں جھٹکے زیادہ لگے ہیں۔ وہ کھانا نہیں کھائیں گے۔" انور سدید کو مسئلہ نفسیاتی نظر آرہا ہے۔ وہ پوچھ رہے ہیں۔ "جھٹکے جہاز کے تھے یا نفسیات کے۔"

ڈاکٹر وحید قریشی مسکرا رہے تھے۔ لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد سلیم اختر کھانے کی میز پر آجاتے ہیں۔ اب وہ آئس کریم کھانے میں شریک ہیں۔ ڈاکٹر اسلم ادیب ان کے پیالے میں آئس کریم ڈال رہے ہیں۔ سلیم اختر کی طبیعت بحال ہو رہی ہے۔ وہ کھانے کے کمرے کے موسم کے ساتھ مطابقت پیدا کر رہے ہیں۔

بہاول پور کی یہ دوپہر خاصی گرم ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے اپنا کوٹ اور انور سدید نے جیکٹ اُتار دیا ہے۔ ایس ای کالج کے سبزہ زار میں بہاول پور کے ادبا جمع ہیں۔ مجلس[1] اُردو نے لاہور کے ادیبوں کے اعزاز میں استقبالیہ مرتب کر رکھا ہے۔ صدرِ محفل ڈاکٹر وحید قریشی ہیں۔ انور سدید بائیں بازو کی نشست پر ادیبوں سے مل رہا ہے۔ وہ سب سے پہلے پروفیسر سہیل اختر سے ملتا ہے اور اُنھیں " ورڈز ورتھ" کی نظم " ڈیفوڈلز" کی ترجمہ نگاری پر داد دیتا ہے۔ پھر سید وجاہت حیدر اختر نظر آجاتے ہیں۔ سامنے رانا پٹیالوی ہیں۔ اُنھوں نے محکمۂ نہر کی ملازمت ترک کر کے سٹیٹ لائف میں مُلازمت اختیار کر لی ہے۔ رشید الزماں سے پہلی مُلاقات ہو رہی ہے۔ پروفیسر عابد صدیق، انور صابر، خورشید ناظر سے وہ پہلے بھی مِل چکا ہے۔ اب تجدیدِ ملاقات ہو رہی ہے۔ انور سدید کو علی تنہا اور ممتاز ملک[2] نظر نہیں آرہے۔ سلیم ملک بتا رہے ہیں کہ وہ اختتام ہفتہ پر گھر چلے جاتے ہیں۔ کل کے جلسے میں سب شریک ہوں گے۔ سامنے ایک شخص کی آنکھیں سیاہ چشمے میں چھپی ہوئی ہیں۔ ارے یہ تو ارشاد متین ہیں! انور سدید نے اُنھیں پہچان لیا ہے۔ ان کے ساتھ مزاح نگار

۱۔ ڈاکٹر صاحب کو تسامح ہوا ہے۔ اِس مجلس کا نام " اُردو مجلس بہاول پور" ہے۔ ان دنوں مجلس کے معتمد عمومی پروفیسر عابد صدیق تھے۔ اگرچہ اِس محفل میں سیکرٹری کے فرائض خورشید ناظر نے انجام دیئے۔

۲۔ ممتاز نام سے بہاول پور میں تین ادبی شخصیات پائی جاتی ہیں۔ لیکن یہاں پر جناب ممتاز احمد خان صاحب مذکور ہیں جو کہ محکمہ اطلاعات میں ضلعی افسر اطلاعات کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں اور حلقۂ احباب ادب کے صدر ہیں۔ لیکن یہ ملک نہیں کہلاتے۔ اِس ضمن میں ڈاکٹر صاحب کو تسامح ہوا ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے۔ "رپورتاژ بہاول پور میں ایک دن" از انور سدید مطبوعہ نوائے وقت۔ ۸۸-۳-۲۸

محمد خالد اختر ہیں اور ایک نوجوان جس کا نام انور سدید کی لوحِ دماغ پر اُبھر نہیں رہا۔ اب مجلس کے سیکرٹری تقریر کر رہے ہیں۔ انور سدید خوفزدہ ہے کہ اس کے بعد شاید مہمانوں کو بھی "زحمتِ تقریر" اٹھانا پڑے۔ لیکن خطرہ ٹل گیا ہے۔ سیکرٹری مجلس سب مہمانوں کو چائے کی میز کی طرف چلنے کی دعوت دے رہے ہیں۔ اَب لوگ اُٹھ کھڑے ہُوئے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر شفیق اُنھیں رُکنے کا اشارہ کر رہے ہیں مسعُود حسن شہاب دہلوی کے صاحبزادے فوٹوگرافی کر رہے ہیں۔ پہلے ایک گروپ، پھر دُوسرا گروپ اور پھر نجانے کتنے۔ جب یادیں لوحِ دماغ پر مدھم پڑ جائیں گی تو یہ تصویریں اِس لمحے کی بازیافت کریں گی۔

چائے کی میز پر ادبا۔ ڈاکٹر وحید قریشی کے گرد جمع ہیں۔ اِن میں سے بیشتر ڈاکٹر صاحب کے شاگرد رہ چکے ہیں۔ ڈاکٹر شفیق کہہ رہے ہیں کہ اَب تو ڈاکٹر صاحب کے شاگردوں کے شاگرد بھی پروفیسر بن چکے ہیں۔ انور سدید، محمّد خالد اختر کے ساتھ آ لگے کھڑے ہیں۔ ان کے ساتھ ارشاد متین ہے۔ گُفتگو کا موضُوع سفرنامہ ہے اور تاریخِ ادب۔ لیکن گفتگو کو اچانک روک کر محمّد خالد اختر کہتے ہیں: "انور سدید آؤ تمہیں "نوپ" کے مصنّف سے ملاؤں۔ آپ نے ان کا ذکر کسی مضمُون میں کیا تھا؟" سامنے وہی نوجوان تھا۔ جس کا نام انور سدید کی لوحِ دماغ پر نہیں اُبھر رہا تھا۔ یہ سعید اختر ہیں۔ ان سے انور سدید پہلی دفعہ ملا ہے۔ لیکن ان کے سفرنامے "نوپ" کا تاثر اس کے ذہن میں مستحکم ہے۔ انور سدید حیرت کا اظہار کر رہا ہے۔ "میں تو سمجھا تھا کہ آپ کم ازکم چالیس کے پیٹے میں ہوں گے۔" "میں ایم۔ اے میں پڑھتا ہُوں۔ انگریزی میرا مضمُون ہے۔ سعید اختر کہہ رہا ہے۔ "نوپ" میرا پہلا مختصر سا سفرنامہ ہے جی۔ میں نے ایک اور سفرنامہ مری کے سفر پر بھی لکھا ہے۔" گفتگو اکرام اللہ کے ناول "گرگِ شب" کی طرف پیشقدمی کر رہی ہے۔ محمّد خالد اختر بتاتے ہیں کہ اکرام نے اب ایک "سفرناولٹ" لکھا ہے۔ اس کا عنوان ابھی قائم نہیں ہُوا۔ لیکن بہت اچھا سفرنامہ نما ناولٹ ہے۔ انور سدید اکرام اللہ کے سفرنامے "دریائے سوات" کا ذکر کر رہا ہے۔ اِس سفرنامے میں دریائے سوات ایک کردار کی صُورت

اُبھرتا ہے اور مصنف کو اپنی شخصیت کا ادراک کراتا ہے۔ کالام کی طرف جاتے ہوئے سوات غراتا اور بپھرتا ہوا کر دار بن جاتا ہے لیکن کالام سے واپس آئیں تو دریا سویا سویا سا لگتا ہے اور منگورہ کے قریب تو وہ اتنے ٹکڑوں میں بٹ جاتا ہے کہ اپنی توانائی برقرار ہی نہیں رکھ سکتا۔ انور سدید نے اکرام اللہ کا سفر نامہ پڑھنے کے بعد مینگورہ سے کالام تک کا سفر ایک ویگن میں کیا تھا اور محسوس کیا تھا کہ اکرام اللہ نے جس باریکی اور فنّی رعنائی سے دریائے سوات کو محسوس کیا تھا۔ اِسی لطافت سے اپنے احساس کو کاغذ پر اُتار دیا تھا۔ اَب وُہ محمّد خالد اختر سے کہہ رہا ہے۔ "مجھے اکرام اللہ کا ناولٹ بھی پڑھوا دیجئے۔ اگر آج مِل جائے تو میں صُبح واپس کر دوں گا۔" محمّد خالد اختر اِسے گھر آنے کی دعوت دے رہے ہیں۔ ارشاد متین کہہ رہا ہے۔ "میں اُنھیں ساتھ لاؤں گا۔" "اچھا تو کھانا میرے ساتھ کھائیں" محمّد خالد اختر کہتے ہیں۔ لیکن انور سدید ڈاکٹر شفیق احمد کا مہمان ہے۔ ان کے بغیر دعوت قبول کرنے سے قاصر ہے۔ ظہور "سطور" کا پہلا پرچہ تقسیم کر رہے ہیں۔ اِس پرچے میں وزیر آغا، قمر جمیل، بلراج کومل، علی تنہا کی تخلیقات شامِل ہیں اور دعوت مطالعہ دیتی ہیں۔

چائے ختم ہو چکی ہے۔ مہمان رخصت ہو رہے ہیں۔ مجمع چھٹ رہا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی اور انور سدید۔ مسعود حسن شہاب دہلوی سے مِلنے کے لِئے جا رہے ہیں۔ مشکور حسین یاد اور سلیم اختر اپنے دڑبے کی طرف لپک رہے ہیں۔ شہاب صاحب کچھ عرصے سے علیل ہیں۔ ان پر فالج کا حملہ ہُوا تھا۔ چلنے پھرنے لِکھنے پڑھنے سے معذور ہو گئے تھے۔ اب ان کی تقریباتی سرگرمیاں قریباً ختم ہو چکی ہیں۔

اورنگ زیب عالمگیر رہنمائی کر رہے ہیں۔ شہاب صاحب کے صاحبزادے گھر پر پہلے پہنچ چکے ہیں۔ اندر جاتے ہیں تو شہاب صاحب کو دیکھ کر طمانیت محسوس ہوتی ہے۔ اب وُہ چلنے پھرنے اور نماز پڑھنے کے قابل ہو چکے ہیں۔ ان کے پلنگ پر چاروں طرف کتابیں بکھری پڑی ہیں۔ وُہ اب بھی تصنیف و تالیف کے کام میں مصروف ہیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی ان کی آپ بیتی "وادی جمنا سے وادی ہاکڑہ تک" کا ذکر کرتے ہیں۔ شہاب صاحب ایک جلد منگوا کر انور سدید کو دیتے ہیں۔

انور سدید نے کچھ عرصہ پہلے اِس کتاب کو سُونگھا تھا اور اِس پر مشفق خواجہ کا تبصرہ پڑھا تھا۔ جو خاصا شوخ ڈھنگ تھا۔ وحید قریشی چائے پینا نہیں چاہتے۔ شہاب صاحب اصرار کر رہے ہیں شہود صاحب کہہ رہے ہیں۔" تقریب کی چائے تو ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر وحید قریشی صاحب جواباً کہہ رہے ہیں۔ "اِس کے ذمّہ دار آپ ہیں۔ آپ نے فوٹو گرافی میں دیر لگا دی۔ چائے ٹھنڈی ہو گئی۔" اِسی لِئے تو اب گرم چائے پیش کر رہا ہوں۔" شہود کہتے ہیں۔ انور سدید اُن کی تائید کر رہا ہے اور چائے کی پیالی میں چینی ڈالنے سے منع کر رہا ہے۔ اِس محفل کو شہود نے اپنے کیمرے میں محفوظ کر لیا ہے۔

کھانے کے بعد ارشاد متین اپنا موٹر سائیکل لے کر آ گئے۔ اب انور سدید اکرام اللہ کا ناولٹ حاصل کرنے کے لِئے مُحمّد خالد اختر کے گھر جانا چاہتا ہے۔ سیّد جاوید اختر کہہ رہا ہے" میں اپنی کار میں چھوڑ آؤں ؟"۔ لیکن انور سدید ارشاد متین کے ساتھ جانا چاہتا ہے۔ مُحمّد خالد اختر کا گھر شہر کے وسط میں ہے۔ لیکن جب بنگلے میں داخل ہوں تو ایک عجیب طرح کی طمانیت کا احساس ہوتا ہے۔ خالد اختر اس گھر میں تنہا رہتے ہیں۔ ان کے بچّے کراچی میں ہیں۔ بنگلے کا سکوت سُخن جُو ہے۔ لیکن جب مُحمّد خالد اختر کتاب پڑھ رہے ہوں یا مزاح تخلیق کر رہے ہوں تو یہ سُخن جو سکوت ان کی خلوت میں دخل اندازی نہیں کرتا۔ مُحمّد خالد اختر نے اکرام اللہ کے ناول کا مسودہ انور سدید کے حوالے کر دیا۔ اَب چائے کی گرم پیالی پر باتیں ہو رہی ہیں۔ ادبی دُنیا کی باتیں، ادیبوں کی باتیں، تصنیفات کی باتیں، وقت کا احساس مِٹ رہا ہے۔ انور سدید واپس یُونیورسٹی ریسٹ ہاؤس میں آیا تو رات کے ۱۲ بج چُکے تھے۔

بہاول پُور کی صحرائی رات بڑی خُوشگوار تھی۔ دِن کے وقت سُورج کی گرم کرنوں نے اپنی تمازت ریت کے ذرّوں کے سُپرد کر دی تھی۔ لیکن رات کے وقت یہ گرمی ہَوا میں تحلیل ہو رہی تھی۔ انور سدید نے کمرے کی کھڑکی کھول دی تاکہ تازہ ہَوا اندر آ سکے اور برقی پنکھا بند کر دیا۔ صُبح اِس کی آنکھ کھُلی تو دروازے پر ڈاکٹر آغا یمین دستک دے رہے تھے۔ آغا یمین اب بہاول پُور یُونیورسٹی

ہیں صدرِ شعبۂ فارسی ہیں۔ آغا امین نے بتایا کہ وُہ لاہور گئے ہُوئے تھے۔ رات کو واپس پہنچے ہیں۔ پتا چلا کہ ڈاکٹر وحید قریشی تشریف لائے ہیں۔ اُن کا کمرہ ابھی نہیں کھلا۔ اِس لئے آپ کا دروازہ آن کھٹکھٹایا۔

"چلئے۔ ڈاکٹر صاحب کو جگاتے ہیں" انور سدید کہہ رہا ہے۔ لیکن آغا امین یہ جسارت کرنے پر آمادہ نہیں اور سامنے کی کُرسی سے اُٹھ کر انور سدید کے ساتھ پلنگ پر بیٹھ گئے ہیں۔ کہہ رہے ہیں۔ "میرا ڈاکٹریٹ کا مقالہ چھپ گیا ہے۔ اور انور سدید آپ کو پتا ہے کہ اب میں انٹرنیشنل شخصیت بن گیا ہُوں۔ امریکن کانگرس آف لائبریریز نے میرے کوائف حیات طلب کئے ہیں۔ میرا مقالہ دُنیا بھر کی لائبریریوں میں چلا گیا ہے۔" انور سدید کو یاد آتا ہے کہ چند سال قبل اِس قسم کے کوائف راغب شکیب سے بھی طلب کئے گئے تھے اور اس بے نیاز آدمی نے اُنہیں اس خدشے کے تحت نہیں بھیجے تھے کہ کہیں وُہ انٹرنیشنل شخصیت نہ بن جاتے۔ راغب شکیب تُم نے کتنا اچھا موقع ضائع کر دیا۔ کوائف بھیج دیتے تو آج انور سدید آغا امین کے سامنے سر اُونچا کر سکتے کہ "ہمارے پاس بھی ایک انٹرنیشنل آدمی ہے جو فارسی بالکل نہیں جانتا۔"

ہوسٹل کا خانساماں کہہ رہا ہے۔ "آغا صاحب۔ آپ کا ناشتا تیار ہے۔ ناشتا کیجئے!"

"اچھا تو پھر کیا پروگرام ہے آج؟ بغداد الجدید چلئے۔ یہاں سے ہر دس منٹ کے بعد بس جاتی ہے بالکل مُفت لے جاتی ہے۔ یعنی کوئی کرایہ نہیں۔ ہمارا شعبۂ فارسی بھی وہاں ہے پہلے سال چھ لڑکے تھے۔ اب تیئیس ہو گئے ہیں۔ مَیں نے ایم۔اے میں مقالہ نگاری بھی شرُوع کرا دی ہے اور طلبہ کو جدید فارسی بولنے کی مشق بھی کرا رہا ہُوں۔" آغا امین کمرے سے نکل کر ناشتے کی طرف رواں ہیں۔ لیکن چلتے چلتے معلُومات کا خزینہ بکھیر رہے ہیں۔ ناشتے کی میز پر ڈاکٹر وحید قریشی، مشکُور حسین یاد، ڈاکٹر سلیم اختر اور انور سدید بیٹھے ہیں۔ ڈاکٹر آغا امین بھی تشریف لے آتے ہیں۔ آج مشکور حسین یاد نے ڈاکٹر وحید قریشی سے ہاتھ نہیں ملایا۔ فضا میں کچھ تناؤ سا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی سلیم اختر کا حال پُوچھ رہے ہیں۔ سلیم اختر توس پر مکھّن لگا رہا ہے۔ مشکُور حسین یاد، آغا امین کو ناشتے میں شریک

ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔ آغا یمین کہتے ہیں۔ "مَیں تو آپ کا میزبان ہوں۔" انور سدید معلوماتِ عامہ کے طَور پر کہہ رہا ہے "میزبان اپنا ناشتا کمرے میں نوشِ جان کر آیا ہے۔" "ارے ؟" یاد صاحب چونک پڑتے ہیں۔ کیا واقعی ؟ آغا یمین بات کو گول کر کے کہہ رہے ہیں۔ فارسی کے شعبہ میں جب مَیں آیا تھا تو صرف چھ طلبہ تھے۔ اب تئیس ہو گئے ہیں۔" ڈاکٹر وحید قریشی کی زبان سے بے اختیار جُملہ آ گیا ہے۔ "تئیسی نکالو گے تو دیکھیں گے۔" آغا یمین اِسے بھی گول کر گئے ہیں۔ ڈاکٹر شفیق اور سلیم ملک کمرے میں داخل ہو رہے ہیں۔ اُنھوں نے لطیفہ نہیں سُنا۔ لیکن قہقہے میں شامل ہیں۔

اب قافلہ انشائیہ سیمینار کے پنڈال کی طرف رواں ہے۔ اسلم ادیب کے ساتھ مشکور حسین یاد اور انور سدید چل رہے ہیں۔ اسلم ادیب انور سدید سے کہہ رہے ہیں۔ "آپ نے انجینئرنگ کی ہمہ وقت مصروفیت کے باوجود بہت کام کیا ہے۔" انور سدید تعریف کے غُبارے میں نوکِ خار چبھونے پر آمادہ ہیں۔ "اجی کہاں۔ مَیں تو عمر بھر جریب کشی کرتا رہا۔ کفنونیاں بناتا رہا ہوں۔ مَیں تو ادب کا ضلعدار بھی نہیں بن سکا ہوں۔" یہ سُن کر مشکور حسین یاد نے اپنی رفتار تیز کر دی ہے۔ وہ انور سدید سے آگے نکلنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ناگاہ ایک پتھر پاؤں میں آ جاتا ہے۔ یاد صاحب کو ٹھوکر لگی ہے۔ لیکن انور سدید نے تھام لیا ہے۔ اسلم ادیب کہہ رہے ہیں۔ "مشکور صاحب آرام سے چلیں۔"

اسلامیہ یُونیورسٹی بہاول پُور کا حال سامعین سے بھرا ہوا ہے۔ انور سدید اگلی نشست پر گردن نہوڑائے بیٹھا ہے۔ اِس کے ساتھ سید جاوید اختر اور سہیل اختر ہیں۔ مائیکروفون سے ڈاکٹر سلیم ملک کی آواز اُبھر رہی ہے۔ "شعبۂ اُردو و اقبالیات، اِسلامیہ یُونیورسٹی بہاول پُور، اپنے طالب علموں کی نصابی ضرورت کے لِئے مذاکروں کا اہتمام کرتا رہا ہے۔ امسال اُردو انشائیہ پر سیمینار منعقد کیا جا رہا ہے کیونکہ یہ موضُوع متنازعہ اور بحث طلب ہے۔ آج کی نشست میں انشائیہ کے فن کی مختلف جہات پر ادب کی معروف شخصیات مقالات پیش کریں گی۔" ڈاکٹر سلیم ملک کی درخواست پر پروفیسر ڈاکٹر ذُوالفقار علی ملک نے کرسیٔ صدارت اور ڈاکٹر وحید قریشی نے مہمانِ خصوصی کی نشست سنبھالی ہے۔ تلاوت کے بعد ڈاکٹر اسلم ادیب میزبان مقرر کی حیثیت سے مقالہ پڑھ

رہے ہیں۔ ان کا موضوع ہے۔" اُردو انشائیے کا دوسرا دور۔ اسلم ادیب کا موقف یہ ہے کہ نقاد نے قاری اور فن کے درمیان پُل کے فرائض انجام نہیں دیئے بلکہ کنفوژن پیدا کیا ہے جس کی مثال انشائیہ کی تنقید ہے۔ میتھو آرنلڈ کے حوالے سے کہہ رہے ہیں کہ انشائیہ کا ایک تخلیقی دَور اب ختم ہونے والا ہے۔ اَب تنقیدی دَور کا آغاز ہونا چاہیئے۔ جس میں انشائیہ تخلیق کرنے کے اصول انشائیوں سے اخذ کیے جائیں۔ اُنھوں نے انشائیہ کی بحث میں شعور کی رَو کا ذکر کیا ہے اور اِس کی مثال سلیم آغا قزلباش کے انشائیہ " انگلیاں" سے دے رہے ہیں۔ اُنھوں نے ڈاکٹر وزیر آغا، جمیل آذر، مشتاق قمر اور شہزاد قیصر کے انشائیوں کا ذکر کیا ہے اور مشکور کے مضمون "سوچ کی آگ اور سمجھ کا سونا" کے بارے میں کہہ رہے ہیں کہ یہ انکشافِ ذات کی بجائے ذاتی المیہ ہے۔

اسلم ادیب تالیوں کی گُونج میں رُخصت ہو رہے ہیں۔ اَب "حروف" کے مُدیر خورشید ناظر مقالہ پڑھ رہے ہیں۔ ان کا موضوع "وزیر آغا کی انشائیہ نگاری" ہے۔ رشید الزمان حزبِ اختلاف کے سب سے طاقتور مقرر ثابت ہوتے ہیں اُنھوں نے انشائیہ کے بارے میں اسلم ادیب کی رائے کو آگے کو بڑھانے کی سعی کی ہے۔ لیکن انور سدید کو محسُوس ہوتا ہے کہ انشائیہ کی بحث میں رواداری اور حق گوئی میں فاصلہ پیدا ہو گیا ہے اور رشید الزمان ادبی بات کو شخصیات میں اُلجھا رہے ہیں۔

مشکور حسین یادؔ نے دُور کی نظر کی عینک اُتار لی ہے۔ وہ مائیکروفون کے سامنے اس طرح جُھکے ہُوتے ہیں جیسے جابر سُلطان کے سامنے کھڑے ہوں۔ ان کا موضوع "انشائیہ میں شگفتگی کا مفہوم" ہے۔ لیکن وُہ شگفتگی کا مفہوم بیان کرنے کی بجائے انشائیہ کی شگفتگی کے اوصاف پیش کر رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں۔" انشائیہ معنی کی تازگی اور ندرت کو آشکار کرتا ہے۔ انشائیہ کی شگفتگی باسی نہیں ہوتی۔ پھُول کی شگفتگی باسی ہو جاتی ہے"۔ مشکور صاحب اپنی کتاب سے ایک طویل اقتباس پڑھ رہے ہیں۔ اَب سلیم مَلک انور سدید کا تعارف کرا رہے ہیں۔" وہ درس و

تدریس کے پیشے سے وابستہ نہیں۔ ان کی تصانیف علمی حلقوں سے داد پا چکی ہیں۔ ان کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ "اردو ادب کی تحریکیں" خاصے کی چیز ہے۔" انور سدید تعریف و تحسین کی اس ڈور کو کاٹنے کے لئے مائیکروفون کی طرف لپک رہا ہے اور اب اپنا مقالہ پیش کر رہا ہے۔ اس کا موضوع "ڈاکٹر وزیر آغا بحیثیت انشائیہ نگار" ہے۔ اس نے "چوری سے یاری تک" کو خصوصی حوالہ بنایا ہے جو ایم اے کی نصابی کتاب ہے۔ انور سدید کہہ رہا ہے۔ انشائیہ کی صنف کا تصور وزیر آغا کے بغیر مکمل نہیں سمجھا جاتا۔ کچھ لوگ اس کے ساتھ منسلک ہونے کی کوشش کر رہے ہیں تو ان کا رویہ اسی طرح کا ہے جیسے ڈاکٹر لطیف نے غالب کے بارے میں اختیار کیا تھا۔ وہ خود غالب تو کیا اس کی سطح کا شعر کہنے کی قدرت بھی نہیں رکھتے لیکن بیڑہ تنقیصِ غالب کا اٹھا لیتے ہیں اور اپنی تنقیدی دیانت کو بھی قربان کر ڈالتے ہیں۔" انور سدید وزیر آغا کی انشائیہ نگاری کے اسرار کھول رہا ہے ان کے بارے میں معاصرین کی آراپیش کر رہا ہے۔ اب وہ کہہ رہا ہے کہ ڈاکٹر سلیم اختر نے ان کا انشائیہ "چالیسویں سالگرہ" پڑھا تو انہیں چارلس لیمب کی کلاسیکی حیثیت کی مثال قرار دیا۔ ممکن ہے ڈاکٹر صاحب نے اپنی رائے تبدیل کر لی ہو۔ حالانکہ نہ چارلس لیمب نے دوبارہ زندہ ہو کر نئے انشائیے لکھے اور نہ وزیر آغا نے انشائیہ "چالیسویں سالگرہ" میں کوئی تبدیلی کی ہے۔ اس جملے پر ہال میں قہقہہ ابھرا ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر اس نشست کے آخری مقالہ خواں ہیں۔ انور سدید اپنے اوپر جوابی حملے کیلئے تیار ہے۔ اب اسے سلیم اختر کا وار برداشت کرنا ہے۔ لیکن سلیم اختر نے لکھے ہوئے مقالے سے اِدھر اُدھر دیکھنے کی ہمت نہیں کی۔ انھوں نے اپنا مقالہ ایک سو دس الفاظ فی منٹ کی رفتار سے پڑھا اور اب واپس جا رہے ہیں۔

ڈاکٹر وحید قریشی مہمان خصوصی کے طور پر تقریر کر رہے ہیں۔ وہ آہستہ آہستہ نجیلے اور رسیلے انداز میں آگے بڑھ رہے ہیں۔ کہہ رہے ہیں "میں نے اردو انشائیہ میں فارسی انشاء کے آثار تلاش کرنے کی سعی کی ہے۔ انشائیہ کی ہیئت سیال ہے۔ اس کی خارجی تکنیک ابھی نہیں بنی۔ اس کے بنیادی رجحانات کو ردِ عمل کے حوالے سے متعین کیا جا رہا ہے۔ نفسِ مضمون میں کلاسیکی روایت

پیشِ نظر رکھی جاتی ہے۔ فارسی سلابچے استعمال ہوتے ہیں۔ اِنشائیہ نگار کا رویہ جذباتی ہے۔ وزیر آغا نے ایک مخصوص فارمیٹ کو پیشِ نظر رکھا ہے اور یہ اُن کا حق ہے کہ جو فارمیٹ چاہیں استعمال کریں۔"

ڈاکٹر وحید قریشی نے تقریر میں ٹ ڈالی ہے اور اب ڈاکٹر ذوالفقار علی ملک صدارتی خطبہ پڑھ رہے ہیں۔ اُن کا مقالہ انشائیہ کی تکنیک کے مسائل کو واضح کرتا ہے۔ اچانک ایک جملہ مشکور حسین یاد کے خلاف سرزد ہو جاتا ہے لیکن پھر موضوع کو بحرِ رجز سے نکال کر دوبارہ بحرِ رمل میں ڈال دیا ہے۔ اور اب وہ اپنے لاہور کے مہمانوں کا شکریہ ادا کر رہے ہیں۔

محفل ختم ہو چکی ہے اور اب ضابطے کی رسمی کارروائی کے مطابق چائے کا دور ہونا چاہیئے تھا لیکن مجمع چھٹ رہا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی اور انور سدید اپنے کمرے کی طرف جا رہے ہیں۔ ڈاکٹر عقیلہ شاہین اُن کے ساتھ ہیں۔ ہوسٹل میں چائے کا آرڈر دیا گیا ہے۔ لمبے وقفے تک چائے نہیں آئی۔ پروفیسر عابد صدیق اطلاع لائے ہیں کہ باورچی دودھ لینے کے لئے شہر چلا گیا ہے۔ تھوڑی دیر میں گرم گرم چائے پیش ہوگی۔ ڈاکٹر وحید قریشی جملہ لگاتے ہیں "یوں کہیئے کہ آپ نے چائے کی فائل کھلوا دی ہے۔" سب لوگ ہنسنے لگے ہیں۔ ڈاکٹر شفیق داخل ہوتے ہیں اور کہتے ہیں "کھانا تیار ہے۔" ڈاکٹر وحید قریشی پھر جملہ لڑھکاتے ہیں "چائے کی فائل پینڈنگ کرا دیں۔" لیکن شفیق کہتے ہیں "چائے کھانے کے بعد پیش ہوگی۔" کھانے کی میز پر ڈاکٹر سلیم اختر مرغ سے نبرد آزما ہیں۔ انور سدید نے اپنی پلیٹ سلاد سے بھر لی ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی تنوری روٹی نہیں کھا سکتے۔ وہ اپنی پلیٹ میں چاول ڈال رہے ہیں۔

آج کی شام سہیل اختر صاحب کی دستک سے وارد ہوئی ہے۔ اُن کے ساتھ سید جاوید اختر ہیں۔ ڈیڑھ گھنٹے کی نشست اب اُن کے گھر پر ہوگی۔ ڈاکٹر وحید قریشی اور انور سدید اُن کے ساتھ چل رہے ہیں۔ یہ لوگ اچانک کاروباری دُنیا سے نکل کر گھریلو ماحول میں داخل ہو گئے ہیں۔ جاوید اختر کے ڈرائنگ رُوم میں اُن کے سب بچے جمع ہیں۔ جاوید اختر اپنے پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے پر گفتگو کر رہے ہیں۔ سہیل اختر اپنے تراجم کا ذکر کر رہے ہیں۔ پہلے ٹھنڈے مشروب کا دور اور پھر گرم

چائے کا دَور چل رہا ہے۔ جاوید اختر کی مصوّر بیٹی اپنی تصویریں دکھا رہی ہے۔ دُوسری بیٹی ان لمحوں کو کیمرے میں محفوظ کر رہی ہے۔ بھابی کِنّو چھیل کر اور سیب تراش کر سامنے رکھ رہی ہیں اور پھر شام کی آخری تقریب شُروع ہو جاتی ہے۔ یہ شعبۂ اُردو کا استقبالیہ ہے لیکن خُوبی یہ ہے کہ اِس میں نہ مقالات پیش کیئے گئے نہ تقریریں ہُوئیں۔ بس غیر رسمی گپ شپ اور مختلف موضُوعات پر رواں تبصرہ اور پھر پُر لُطف چائے۔ آج کا پروگرام ختم ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی، ظہور ملک صاحب کو مِلنے جا رہے ہیں۔ علی تنہا، انور سدید کا اِنٹرویو ریکارڈ کرنے کے لیئے اُسے ریڈیو اسٹیشن لیجا رہے ہیں۔ ممتاز ملک اور ارشاد متین اُن کے ہمراہ ہیں۔ بات چیت ادبی موضُوعات سے ہٹ کر ادبی سیاست کی طرف چلی جاتی ہے۔ منوّر جمیل قریشی نے ظہُور نظر کی کلیات چھاپ دی ہے۔ اِس کی پُشت پر نوشی گیلانی کی تصویر ہے۔ راؤ ریاض الرحمٰن اِس جسارت پر ناراض ہیں۔ لاہور کا غُصّہ مُحمّد خالد کی طرف منتقل ہو گیا ہے۔ خالد صاحب حیران ہو رہے ہیں۔ پھر ایک پُولیس افسر مطلع پر نمُودار ہوتا ہے اور ایک بڑے ادیب کو دھمکی دیتا ہے۔ "میں تُمہاری تبنی اُتار دوں گا۔" بڑا ادیب اپنے لباس کی طرف دیکھ رہا ہے۔ "مَیں تو شلوار پہنتا ہی نہیں ہُوں۔ تُم تبنی کیا اُتارو گے۔" انور سدید کواکب کا جائزہ لے رہا ہے۔ محبّتوں کے جزر و مد کو دیکھ رہا ہے اور حیران ہو رہا ہے۔ افسانہ نگار علی تنہا اِس سے دریافت کر رہے ہیں۔ "ادبی گروہ بندیوں نے اُردو ادب کو نقصان پہنچایا ہے یا فائدہ؟ - ادبی دبستانوں نے فن پارے کی تحسین و تنقید کو کس طرح متاثر کیا ہے؟ شہرت فن سے آگے نکل جائے تو ادیب کو فائدہ پہنچتا ہے۔ یا ادب کا نُقصان ہوتا ہے!" ـــــ اس وقت ریڈیو اسٹیشن کے اسٹوڈیو میں علی تنہا اور انور سدید باتیں کر رہے ہیں۔ یہ باتیں کل رات کو ہَوا کی لہروں کے سُپرد کر دی جائیں گی اور پھر بات خُدا جانے کہاں تک پہنچے۔

آج اِنشائیہ سیمینار کی آخری نشست ہے۔ اِس نشست میں صِرف اِنشائیے پڑھے جائیں گے۔ صدارت کی کُرسی پر آج بھی ڈاکٹر ذُوالفقار علی ملک بیٹھے ہیں۔ لیکن مہمانِ خصُوصی کی کُرسی خالی پڑی ہے۔ یہ فریضہ ڈاکٹر وحید قریشی اپنی زیریں نشست پر بیٹھ کر ہی سرانجام دے رہے ہیں۔ اسٹیج

ڈاکٹر اسلم ادیب کے ہاتھ میں ہے۔ اُنھوں نے میزبان انشائیہ نگار سلیم ملک کو دو انشائیے پڑھنے کی دعوت دی ہے۔ اُنھوں نے "ٹیلیفون" اور "بچے اور اسکول" کے موضوع پر اپنے ذہن کی آزاد ترنگ کی تحریری صورت پیش کی ہے۔ اُن کو اپنے جملوں پر داد مل رہی ہے۔ وہ کہہ رہے ہیں۔ "تدریس وہ کاروبار ہے جس کے لیے پڑھے لکھے ہونے کی ضرورت نہیں" "لوگ بچوں کی فوج ظفر موج اس لیے بنا لیتے ہیں کہ کوئی بچہ تو ترپ کا پتا ثابت ہوگا، کوئی بچہ تو بڑھاپے کی لاٹھی بنے گا۔" "ٹیلیفون کی وی آئی پی حیثیت ختم ہوگئی ہے۔ یہ غریب کی جورو بن گیا ہے جو سب کی بھابی ہوتی ہے۔"

پروفیسر عابد صدیق نے "دکاندار" کے گوشے اُبھارے ہیں اور یہیں سے وہ نئے موضوع "خوئے سوال" کی طرف آگئے ہیں۔ انور سدید کو محسوس ہوتا ہے کہ عابد صدیق اپنے اندر اچانک غوطہ لگا جاتے ہیں اور مغلوبِ گماں لوگوں میں صاحبِ یقین ہونے کا ثبوت فراہم کر دیتے ہیں۔ ان کا قول ہے کہ ہمارے نظامِ تعلیم میں ضرور کسی دکاندار کا ہاتھ ہے۔ وُہ کہہ رہے ہیں کہ "حیوان حواس یا جبلتوں سے کام لیتا ہے۔ جو حواس اور دماغ سے کام لے وہ سائنسدان ہے۔ جو صرف ہاتھ سے کام لے، وہ مزدور ہے۔ جو ہاتھ اور عقل سے کام لے وُہ دکاندار ہے! نالہ پابندِ نے ہو جائے تو اوریجنیلٹی ختم ہو جاتی ہے۔ گلتے اور دفتر کے اہل کار الگ الگ قسم کے جانور ہیں۔"

"اب مشکور حسین یاد کو بُلایا گیا ہے۔ وُہ اپنا مختصر ترین انشائیہ پیش کر رہے ہیں۔" میں نے اپنا پہلا انشائیہ ۱۹۳۹ء میں لکھا تھا اور ہندوستان سے ایک کتاب شائع ہوئی ہے جس میں صرف میرا انشائیہ شامل ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ "حضرات میں خشک قسم کے انشائیے لکھتا ہوں۔" پھر وہ انور سدید کی طرف دیکھ کر بولتے ہیں۔ لفظ خُشک وادین میں استعمال کیا ہے۔" ان کے دوسرے انشائیے پر بھی خُشکی غالب رہتی ہے مشکور حسین یاد پڑھے بغیر ورق اُلٹ رہے ہیں۔ لیکن کوئی سُننے پر آمادہ نہیں۔ مشکور حسین یاد رخصت ہو رہے ہیں اور انور سدید مائیکروفون کی طرف

بڑھ رہا ہے۔ وُہ محفل کے مزاج میں شگفتگی پیدا کرنے کے لئے کہہ رہا ہے۔ "حضرات میں آپ کو صرف ایک انشائیہ سناؤں گا۔ میرے حصّے کا ایک انشائیہ مشکُور صاحب پڑھ گئے ہیں۔ اُنھوں نے آپ کو دو کی بجائے تین انشائیے سُنائے ہیں!" محفل ہنس پڑی ہے اور اب وہ اپنا انشائیہ "پتنگیں" سنا رہا ہے۔

ایئرپورٹ پر پہنچنے کا وقت قریب آرہا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے گھڑی دیکھ کر اپنی تقریر مختصر کر دی ہے۔ وُہ کہہ رہے ہیں کہ انشائیہ کی نئی صنف کو قدیم ادب کے ساتھ ملایا گیا ہے۔ جس سے گنگا جمنی کیفیت پیدا ہوگئی ہے اور ضرورت اس بات کی ہے کہ انشائیہ کا فنّی مدار وسیع کیا جائے۔

سیمینار کے آخری مقرّر ڈاکٹر ذوالفقار علی ملک ہیں۔ لیکن وقت ان کے راستے میں رکاوٹ بنا ہُوا ہے اور وہ انشائیہ نگاروں پر بحث سے گریز کرتے ہُوئے بات کو سمیٹ رہے ہیں۔ اور لیجئے اُنھوں نے بڑی خوش اُسلُوبی سے تقریر ختم کر دی ہے۔ ہال تالیوں سے گونج رہا ہے۔ بہاول پُور کا یہ انشائیہ سیمینار جس میں متعدّد نئے سوالات اُبھرے ہیں۔ اختتام کو پہنچ چُکا ہے۔ ایئرپورٹ پر ڈاکٹر وحید قریشی اور انور سدید ایک صوفے پر بیٹھے ہیں۔ سلیم اختر اور مشکُور حسین یادؔ کچھ پرے جا بیٹھے ہیں۔ لاہور کی طرف جہاز کی پرواز میں صرف تیس منٹ باقی ہیں۔

بالواسطہ

خورشید ناظر

ادبی ایڈیشن ۱۶ اپریل ۱۹۸۸ء
روزنامہ "ستلج" بہاول پور

آج کل بہاول پور میں ادبی سرگرمیاں عروج پر ہیں۔ ان سرگرمیوں میں انشائیہ سیمینار، ایس۔ ای کالج کا مشاعرہ اور جشنِ بہاراں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اس مختصر کالم میں بیک وقت ان سب کا تذکرہ ممکن نہیں۔ اس لئے آج کا کالم انشائیہ سیمینار کے لئے وقف کرتا ہوں۔ ریڈیو بہاول پور کی ادبی و دیگر خدمات سمیت باقی موضوعات اپنے آئندہ کالموں میں مناسب ترتیب کے ساتھ پیش کروں گا۔

کسی ادارے کی یہ بہت بڑی خوش نصیبی ہوتی ہے کہ اُسے کسی متحرک شخصیت کی خدمات میسّر آجائیں۔ اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور کا شعبۂ اردو اس لحاظ سے یقیناً بہت خوش نصیب ہے کہ اسے ڈاکٹر شفیق احمد جیسے مخلص، محنتی، مہربان اور موزوں ترین اُستاد کی رہنمائی نصیب ہے جو اس شعبے کی بہتری کے لئے ہمہ وقت کوشاں رہتے ہیں۔ اسلامیہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر ذوالفقار علی ملک اس بات پر بجا طور پر مسرور ہوں گے۔ کہ ان کی معاونت کیلئے ڈاکٹر شفیق احمد

بالواسطہ

خورشید ناظر

ادبی ایڈیشن ۱۶ اپریل ۱۹۸۹ء
روزنامہ "ستلج" بہاول پور

آج کل بہاول پور میں ادبی سرگرمیاں عروج پر ہیں۔ ان سرگرمیوں میں انشائیہ سیمینار، ایس۔ ای کالج کا مشاعرہ اور جشنِ بہاراں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اِس مختصر کالم میں بیک وقت اِن سب کا تذکرہ ممکن نہیں۔ اِس لِئے آج کا کالم اِنشائیہ سیمینار کے لِئے وقف کرتا ہوں۔ ریڈیو بہاول پور کی ادبی و دیگر خدمات سمیت باقی موضوعات اپنے آئندہ کالموں میں مناسب ترتیب کے ساتھ پیش کروں گا۔

کِسی ادارے کی یہ بہت بڑی خوش نصیبی ہوتی ہے کہ اُسے کسی متحرک شخصیت کی خدمات میسّر آجائیں۔ اِسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور کا شعبۂ اُردو اِس لحاظ سے یقیناً بہت خوش نصیب ہے کہ اسے ڈاکٹر شفیق احمد جیسے مخلص، محنتی، مہربان اور موزوں ترین اُستاد کی رہنمائی نصیب ہے جو اِس شعبے کی بہتری کے لِئے ہمہ وقت کوشاں رہتے ہیں۔ اِسلامیہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر ذوالفقار علی ملک اِس بات پر بجا طور پر مسرور ہوں گے۔ کہ اُن کی معاونت کیلئے ڈاکٹر شفیق احمد

جیسا جوہرِ قابل ان کے ادارے میں موجود ہے جو نہ صرف اِن کے لیے بلکہ شہر کے لئے نیک نامی کے وسیلے تلاش کرتا رہتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ملک صاحب کی سرپرستی کے تسلسل اور معاونت کے باعث شعبۂ اُردو خُوب سے خُوب تر کی طرف اپنا سفر اِسی جذبے اور توانائی سے جاری رکھے گا۔

گذشتہ دنوں اِسلامیہ یُونیورسٹی بہاول پُور کے گھوٹوی ہال میں یُونیورسٹی کے شعبۂ اُردو و اقبالیات کے زیرِ اہتمام دو روزہ اِنشائیہ سیمینار منعقد ہُوا۔ ہر چند اِس سیمینار کے اغراض و مقاصد یہ بیان کئے گئے تھے کہ اِس میں جو مقالات پڑھے جائیں گے۔ اُن سے شعبے میں زیرِ تعلیم طالب علموں کو اِنشائیے کو سمجھنے میں مدد ملے گی لیکن میرے نزدیک اِس سیمینار کے اغراض و مقاصد مذکور مقاصد سے کہیں زیادہ تھے۔ جی چاہتا ہے کہ میں اِس منصوبہ ساز ذہن کی ذہانت کو کھل کر داد دُوں جس کے طفیل جہاں طالب علم اِنشائیے کے فنّی پہلوؤں، تعریفوں اور اِس پر ہونے والے مباحث سے پُوری طرح آگاہ ہو پائے۔ وہاں ادب کے بھی طالب علموں نے بھی اکتسابِ علم کیا۔ اِس کے علاوہ بہاول پُور میں محترم ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر انور سدید اور مشکور حسین یادؔ جیسے مشاہیرِ ادب کا تشریف لانا، بذاتِ خود بہاول پُور کی ادبی تاریخ میں ایک اہم واقعہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس موقع پر اُردو مجلس بہاول پُور نے اِنشائیہ سیمینار کے مندوبین کے اعزاز میں ایک عصرانہ ترتیب دیا جس میں شامل ہونے والے ادیبوں اور شاعروں کو ایک دُوسرے کی شخصیّات کو قریب سے دیکھنے کا موقع مِلا۔

اِنشائیہ سیمینار دو نشستوں پر محیط تھا۔ پہلی نشست میں راقم کے علاوہ ڈاکٹر اسلم ادیب، پروفیسر محمد رشید چوہدری، ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر سلیم اختر[۱] اور مشکور حسین یادؔ نے اِنشائیے پر اپنے اپنے مقالات پیش کیے اور دُوسرے روز دُوسری نشست میں ڈاکٹر سلیم ملک، پروفیسر عابد صدّیق، ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر سلیم اختر اور مشکور حسین یادؔ نے اِنشائیے پیش کیے۔ اِن دونوں نشستوں سے محترم وائس چانسلر صاحب اور جناب وحید قریشی نے صدر اور مہمانِ خصُوصی کے طور پر خطاب کیا۔ مجھے ان دونوں نامور شخصیّات کا ذاتی حوالے سے اور شہر کی طرف سے شکریہ ادا کرنا ہے۔ وائس چانسلر صاحب

۱۔ واضح ہو کہ ڈاکٹر سلیم اختر نے اِنشائیہ نہیں پڑھا۔ یہاں کالم نگار کو تسامح ہُوا ہے۔

نے یُوں تو بھی مقالہ اور انشائیہ نگاروں کے لِئے کلماتِ خیر عطا فرماتے لیکن مجُھے جس محبت سے سرفراز کیا، اُس کے لِئے مَیں اُن کا ممنُون ہوُں۔

ڈاکٹر وحید قریشی کو ایک ایسی شخصیت کہنا بجا ہوگا جو ادب کے ہر لمحے کو اپنی گرفت میں رکھتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے بہاول پُور کی ادبی خدمات اور انشائیہ سیمینار کے سِلسلے میں جن کھرے، سچے اور وقیع خیالات کا اظہار فرمایا۔ اُس کے لِئے اہلِ بہاول پُور اُن کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں کیوُنکہ نام نہاد ادبی مراکز سے آج تک جتنی شخصیات یہاں تشریف لائیں۔ اُنھیں اِس قسم کے سچ بولنے کی کبھی توفیق نہیں ہوُئی۔ کیوُنکہ اِس قسم کے سچ میں اُن کی اپنی ذات کی نفی ہونے کے ساتھ سرکاری سطح پر ہونے والی ادبی تقاریب میں نمائندگی کے مسائل کھڑے ہونے کا خدشہ ہوتا ہے۔ جن میں اب تک سوائے چند ایک کے ایسے سفارشی اور بصد منت وسماجت مدعو کئے جانے والے لوگ شرکت کرتے رہے ہیں، جن کا ادیب و شاعر ہونا بھی مشکُوک ہے۔ کیوُنکہ وہ ایسے امتحانوں سے کنی کتراتے ہیں جو اساتذہ نے صدیوں سے سچائی کی پرکھ کے لِئے مقرّر کر رکھے ہیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی! میں آپ کو سلام کرتا ہوُں کہ آپ نے صحرا میں سچ کے پھُول کھِلائے۔

نظم گوئی اور نثر نگاری ہو یا تنقید نگاری، یہ بات اِنتہائی اِحتیاط اور اِعتماد سے کہی جا سکتی ہے کہ بہاول پُور ان تمام میدانوں میں کسی بھی ادبی مرکز سے پیچھے نہیں۔ لیکن زندگی کے ہر ایک شعبے میں ستلج سے اِدھر رہنے والے لوگوں کو ستلج پار کے لوگوں نے کہنیاں مار کر جس طرح پیچھے کیا ہوا ہے۔ اُنہیں اپنے اِس غیر ضروری عمل کو ایک نہ ایک دِن ترک کرنا پڑے گا۔

مَیں ڈاکٹر شفیق احمد سے توقّع کرتا ہوُں کہ وُہ محترم وائس چانسلر کی ادب نوازی اور علم پروری سے فائدہ اُٹھاتے ہوُئے اِنشائیہ سیمینار کی طرز پر دیگر اصنافِ ادب کی محافل کا بھی اہتمام کریں جن کی ہمہ جہت افادیّت ہر قسم کے شک وشُبہ سے بالاتر ہے۔

زیر اہتمام مجلس اقبال شعبۂ ... اقبالیات
اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور